عشق ۱۹۴۶ء

شمعِ پاکستان کے ان پروانوں کے
نام جنہیں ہم فراموش نہیں کر سکتے

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

(اقبال)

ایم ظہیر پرنٹر و پبلشر نے استقلال پریس سے چھپوا کر اردو بک سٹال سے شائع کیا۔

عنوانات

عرضِ ناشر

۴۷ء کے ہولناک فسادات سے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن پھر بھی کم۔ اکثر مصنفین نے اِدھر اُدھر کے بے ربط واقعات کے من گھڑت افسانے لکھ کر کتابی صورت میں شائع کر دیے ہیں، اپنی طرف سے قوم کو کچھ بتایا ہی نہیں کہ ان حوادث کے اسباب کیا تھے اور ان کے گذر جانے کے بعد اب قوم کو کیا کرنا چاہیئے۔ یہ کتاب ایک خاندان کے چند افراد کی سچی اور مربوط سرگذشت ہے جسے پنجاب کے ادیب و شاعر میر ولی وارثی نے لکھا ہے۔ ولی صاحب اُس انقلابی

دور میں صوبہ مسلم لیگ کی طرف سے مسلم لیگ نیشنل گارڈ امرت سر کے ناظمِ اعلیٰ تھے۔
اب آپ ان واقعات کی اہمیت کے متعلق جو اس ناول میں لکھے گئے ہیں، خود ہی اندازہ لگائیے۔

ناشر

مُسلم آباد

(۱)

مسلم آباد کے آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ شہر کے مختلف مقامات سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ شعلے آسمان تک اُڑنے کے لئے لپکتے تھے۔ شاید وہ بادلوں میں گھل مل کر دل کی پیاس بجھانا چاہتے تے۔ افق سے کچھ اُوپر چاند بار بار گھٹاؤں سے نکل کر دیکھتا اور پھر چھپ جاتا۔ اس وقت دنیا کی کیفیت ہی کچھ ایسی تھی کہ دیکھنا تو درکنار سننے ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ خوفناک افواہیں شہر سے قصبوں کی طرف حملہ آور ہوتیں اور گرد و نواح کے پُرامن دیہاتوں پر وحشت و بربریت کی بجلیاں گراتیں۔ افواہیں سن کر عوام ہراساں ہوتے اور دل میں طرح طرح کے منصوبے باندھتے۔ کوئی کہتا کہ یہاں

سے بھاگ جانا چاہیئے۔ کوئی کہتا کہ بھاگ کر جائیں گے کہاں؟ ہر طرف دشمن کی فوج اور پولیس کھڑی ہے۔ ہمارے وطن کے درخت وہ دور میلوں پرے لہلہاتے نظر تو آتے ہیں لیکن ان تک پہنچنا آسان نہیں۔ کاش ہم ان کی گھنی چھاؤں میں پہنچ سکتے، خواہ فاقوں مرتے لیکن ہماری قبر تو اسلامستان میں ہوتی، کبھی کوئی بھولا بھٹکا مسافر فاتحہ ہی پڑھ دیتا ــــ اس قسم کی گفتگو سے چڑ کر کوئی اور کہتا ــــ بُزدل نہ ہو، حوصلے سے کام لو، معلوم ہوتا ہے کہ تم موت سے ڈرتے ہو۔ یہ سنتے ہی پہلا جواب دیتا ــــ نہیں موت سے نہیں ڈرتا، بلکہ اس انجام سے ڈرتا ہوں جو مرنے کے بعد ہماری نعشوں کا ہوگا۔ کتے کھائیں گے، گدھ نوچیں گے اور عجب کیا جو ہمیں کافروں کے مرگھٹ میں جلا دیا جائے۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہمارے دشمن بہادر ہیں، بلکہ بدترین قسم کی بزدل اور سفاک قوم سے پالا پڑا ہے، جن کی بہادری کا معیار نہتوں پر ٹوٹ پڑنا، معصوم بچوں کو ہلاک کرنا ہے۔ اُن کے تعصب کی انتہا یہ ہے کہ ماں کے پیٹ میں جنین کو ذبح کر دیتے ہیں۔ چلو ذرا تم بھی تو ایسا کر کے دکھاؤ۔ یہ پڑوس میں غیر مسلموں کے چند مکان ہیں اور نتھو رام کی چھ سالہ بچی تو اب بھی تمام تمام دن تمہارے گھر میں کھیلتی رہتی ہے۔ ذرا اسی پر خنجر آزمائی کرو۔ مگر نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے۔ لو تمہاری آنکھوں میں تو ابھی سے آنسو آ گئے۔ ایں کیا ہو گیا تمہیں؟ تم تو جرمن کی لڑائی دیکھے ہوئے ہو۔ تمہارے ان مضبوط ہاتھوں نے سینکڑوں دشمنوں کو پرائی قوم کی خاطر موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ اس وقت تو تمہارا دل نہ لرزا۔ آج اسلام کی خاطر ایک کافرزادی پر ہاتھ اُٹھانے سے ڈرتے ہو۔ تمہاری عقابی آنکھوں کی چمک کہاں گئی، نظریں دھندلی سی کیوں ہیں۔

جانتا ہوں کہ تم بے قصور ہو۔ نتھو رام کی بچی کو ہلاک کرنا تمہارے بس کا کام نہیں۔ یہ مہم تو شاید خالد بن ولید سے بھی سر نہ ہو سکے۔ معصوم بے گناہ بچی پر ہاتھ اٹھانا مردوں کا شیوا نہیں۔ بچے معصوم ہیں، پاک ہیں خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں۔ اسلام بچوں بوڑھوں اور عورتوں پر ہاتھ اٹھانے سے روکتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ بچے بڑے ہو کر ہمارے ممد و معاون ثابت نہ ہوں گے۔ پھر ان غریب معصوموں کو کیا معلوم کہ یہ ہندو مسلمان کیوں لڑتے ہیں اور شہر سے شعلے کیوں اٹھ رہے ہیں۔ یہ دھماکے کیا ہیں۔ ان کی بلا جانے کہ گلی کی بجلیاں کیوں بجھی ہوئی ہیں۔ اماں ابا کے چہرے کس لئے اترے ہوئے ہیں اور وہ چپ چاپ کیوں ہیں اور انہیں اداس دیکھ کر ہم کیوں ڈر گئے ہیں۔ اسلام کی تاریخ جنگوں اور فتوحات کے واقعات سے بھری پڑی ہے بعض واقعات محیر العقول بھی ہیں۔ بحرِ ظلمات میں گھوڑے ڈال دینا، چند سو کا ہزاروں پر غالب آنا، ایک ایک دن میں تین تین سو قلعے فتح کرنا سب کچھ مرقوم ہے لیکن دنیا کا کوئی مورخ یہ نہیں بتا سکتا کہ اُن جرار لوگوں نے نہتوں پر حملے کئے ہوں، معصوم بچوں کو کاٹ ڈالا ہو۔ ان بزدل ظالموں کو کیا خبر کہ شجاعت کسے کہتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ان لوگوں کو کبھی گنگا اور جمنا کے میدان سے باہر اقتدار نصیب نہیں ہوا، ہندوستان کی سرزمین سے باہر انھوں نے کبھی لشکر کشی نہیں کی۔ یہ کنویں کے مینڈک کیا جانیں کہ قوموں پر غلبہ کس طرح پایا جاتا ہے، اور مغلوب قوموں سے کیا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ سلطنت اور جہانبانی کے طریقے بادشاہ ہی جانتے ہیں۔

مختصر یہ کہ محلے میں ہر قسم کے لوگوں میں کچھ ایسی ہی گفتگو ہو رہی تھی۔ خیالات سب کے ایک جیسے تھے البتہ لب و لہجہ میں فرق تھا۔ یہ تو تھا اُن کا کئی دنوں سے نقشہ مگر آج کی رات کا ماحول نہایت خطرناک تھا۔ چاروں طرف فتنہ و فساد کی آگ بھڑک رہی تھی۔

مگر ابھی تک اس محلے میں سکون تھا۔ ہر طرف مبہوت سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی شہر کے دوسرے حصوں سے گونجتے ہوئے نعروں کی آواز اس سکوت میں لرزش سی پیدا کرتی اور بس۔ رات اس قدر بھیانک تھی کہ چمگادڑوں نے بھی ڈر کر باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ گلی کے کتے اور بازاروں میں آوارہ پھرنے والی گائیں نہ جانے کہاں چھپ گئی تھیں۔ دور دور تک کوئی انسان یا حیوان نظر نہیں آتا تھا۔ بعض اوقات جب کوئی گھبرا کر کھڑکی سے بازار کی طرف جھانکتا تو چوک کے نل پر دشمن کے سپاہی کا گمان ہوتا۔ دیکھنے والا گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتا اور گھر والوں سے کہتا دشمن کھڑا ہے۔ کوئی پوچھتا "کہاں ہے دشمن؟" تو پہلا جواب دیتا "کھڑکی سے جھانک کر دیکھو ذرا احتیاط سے بائیں طرف"۔ دیکھنے والا جھانک کر فوراً پیچھے ہٹتے ہوئے کہتا "ہاں چوک میں کھڑا ہے ظالم ہلتا بھی تو نہیں"۔ چاند کی ہلکی سی روشنی جو بادلوں کی اوٹ سے کبھی کبھی نکلتی تو اس سے اس خوفناک منظر میں ایک اور اداسی پیدا ہو جاتی۔ لوگ گھبرا گھبرا کر بار بار دیکھتے۔ آخر کسی کے نشانے کی گولی اس پانی کے نل سے ٹائیں کی آواز پیدا کر کے ٹھنڈی ہو جاتی۔ اس آواز کے ساتھ ہی لوگوں کے شکوک رفع ہو جاتے اور ٹارچ کی روشنی اور بھی تشفی کر دیتی۔ عورتیں سکھ کا سانس لیتیں، بچے پھر کہنے لگتے۔ جوان شرم سے کھسیانی ہنسی ہنستے کہ خواہ مخواہ پانی کے نل کو سپاہی سمجھ بیٹھے۔ اگر سپاہی بھی ہوتا تو اس کی کیا حقیقت تھی۔ مگر نہیں ان کا ڈرنا درست تھا۔ اس دور میں دشمن کا سپاہی اپنے ساتھ حکومت وقت کی تمام قوتیں وابستہ رکھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ قتل و خون حکومت کے ایما سے ہو رہا ہے۔ حکومت کی نظروں میں سب سے بہادر وہی ہے جو زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دے۔ مسلمان خواہ آمادۂ فساد

ہوں یا نہ ہوں، خواہ میدانِ کارزار میں مدافعت کے لیئے نکلے ہوں یا گھروں میں مقید ہوں، بہرکیف جہاں کہیں بھی ہوں انھیں قتل کر دیا جائے۔ میدان میں ہوں تو گولی مار دی جائے۔ گھروں میں ہوں تو عمارتوں کو پھونک دیا جائے۔ وہ ناپاک ہیں، غیر ملکی ہیں، انھوں نے اپنے آبا و اجداد کی املاک کا مطالبہ کیا ہے۔ وہ ہم میں مدغم ہونا نہیں چاہتے۔ وہ ہزار برس ہندوستان کے تخت پر قابض رہنے کے باوجود بھی اس کے حق دار نہیں، اور ہم ہزار برس غلام رہنے کے بعد بھی اس کے جائز وارث ہیں۔ بس انھیں قتل کر دو خواہ انھوں نے تمام عمر کانگرس کی خدمت میں گزاری ہو۔ خواہ کوئی مسلمان پاکستان کا مخالف ہی ہو اُسے مار ڈالنا ہی مناسب ہے۔ ہم اس سرزمین "بھارت" پر تنِ تنہا ہی رہنا چاہتے ہیں۔ شاید دنیا کی دیگر اقوام سے کوئی واسطہ ہی نہیں رکھنا چاہتے۔ نیست و نابود کر دو ان کو، یہ خدا کا نام عربی میں لیا کرتے ہیں۔ انھوں نے ہمیں ہزار برس تک اپنے سایۂ عاطفت میں پرورش کیا ہے۔ ان کا قصور یہ ہے کہ انھوں نے نو سو برس میں ہمیں مٹانے کے لیئے تلوار تک نہیں اُٹھائی۔ تم عقلمند ہو ایسی غلطی نہ کرو۔ کچل دو، بچوں بوڑھوں کو کاٹ دو اور ان کی عورتیں چھین لو کیونکہ تمہارا اخلاق یہی کہتا ہے۔ جب ان کے پاس تلوار ہو گی جب یہ مسلح ہوں گے تو پھر یہ مسلمان تم سے نہیں دبنے کے۔ آج یہ نہتے ہیں ان کی فوجیں برما میں ہیں ان کی پولیس پاکستان چلی گئی ہے اور ان کا خدا مکّے میں ہے۔ اب ان کا پُرسانِ حال کوئی نہیں۔ اگر تمہیں انگریز بہادر کا خوف ہے تو اُسے بھی بھول جاؤ۔ وہ تو اسلام کا ازلی دشمن ہے۔

غرضیکہ دشمن کا ہر فردِ بشر ان خیالات کو لئے برسرِپیکار تھا۔ اور اُدھر فرزندانِ اسلام بے بسی کے عالم میں جائے پناہ ڈھونڈھ رہے تھے۔ دشمن یہ ارادہ کر چکا تھا کہ عربی میں خدا کا نام

لینے والے کا نام و نشان نہیں چھوڑے گا۔ وہ خود بھی خدا کا ماننے والا تھا لیکن کسی اور زبان میں۔ یوں تو دنیا کی تمام قومیں، تمام مذہب خدا کو کسی نہ کسی نام سے پکارتی ہیں، سبھی اس کے چاہنے والے ہیں لیکن نہیں معلوم کہ اس یک رنگی کے باوجود ان میں ایک دوسرے کو مٹانے کا جذبہ کیوں ہے۔ محض زبان کے اختلاف پر یہ نفرت کیسی ہے؟ اور یہ فسادات محض خدا کے نام پر کیوں شروع ہوتے ہیں۔ اور بھی تو بہت سی باتیں ہیں، مثلاً اس بات پر جھگڑا کبھی نہیں ہوا کہ مسلمان پانی کو جل کیوں نہیں کہتے اور بھوجن کو طعام کیوں کہتے ہیں۔ جھگڑا ہے تو اسی ایک بات پر کہ اللہ اللہ پکارنے والے رام رام پکارتے نہیں، تو ہندوستان چھوڑ جائیں۔ مسلمانوں نے اپنے عہدِ حکومت میں کبھی کسی کو جبراً مسلمان نہیں بنایا۔ آج بھی اسلامی ممالک میں ہزاروں غیر مسلم آباد ہیں لیکن اکثریت ان پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالتی۔ جو میری رائے پوچھیے تو یہی مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ مسلمانوں نے نو سو برس بھارت پر حکومت کی لیکن۔ ہندوؤں کو اسلام تو کیا اپنا تمدن بھی نہیں دے سکے اور انگریز ایک صدی میں سب کو "کرسٹان" بنا گیا۔ ہر فرقے نے اس کے کوٹ پتلون اور تہذیب کو اپنایا۔ بات بھی ٹھیک ہے کہ ہندو مسلمانوں کا تمدن کیوں اپناتے۔ اکبر جیسا بیوقوف تو خود ہندو رانیوں کی خوشنودی کے لئے ہندوانہ لباس پہنتا تھا اور ویسے ہی رسم و رواج پسند کرتا تھا تو پھر رعایا کو کیا پڑی تھی کہ بادشاہ کا تمدن اپناتی۔ اگر آپ یہ کہیں کہ یہ اکبری رواداری تھی تو معاف کیجئے یہ رواداری نہیں اسلام سے غداری تھی۔ رواداری کے یہ معنی نہیں کہ ہم کسی کی خاطر اپنے مذہب کے اصول ترک کر دیں۔ رواداری یہ ہے کہ رعایا کو اپنے مذہب اور روایات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی

اجازت ہو۔ اُسے جبراً شاہی مذہب یا تہذیب میں داخل نہ کیا جائے۔ آپ دیکھئے کہ انگریز نے جبراً کسی کو کوٹ پتلون کے لئے نہیں کہا۔ اُس نے بڑی دانشمندی سے کالج اور سکول کی زندگی کو اس سانچے میں ڈھال دیا کہ ہم غیرامادی طور پر مغربی تہذیب کے دلدادہ بن گئے۔ یہاں تک کہ ہم نے اپنی زبان تک بھی چھوڑ دی۔ لیکن ہندوستان کے مسلم تاجداروں نے ایسی کوئی چال نہ چلی۔ مغلیہ خاندان میں لے دیکر ایک اورنگ زیب تھا جو مذہبی تبلیغ کا شوق رکھتا تھا۔ وائے قسمت وہ بھی غلط راستے پر پڑا رہا۔ وہ ہندوؤں کو مسلمان بنانے کی بجائے دکن کی بہمنی ریاستوں سے لڑتا رہا محض اس لئے کہ اُن کے حکمراں شیعہ تھے۔ نہیں معلوم یہ نفاق کے جراثیم مسلمانوں میں کہاں سے آئے ہیں۔ خدا رحم کرے۔

آمدم برسر مطلب۔ دشمن مسلمانوں کو مٹانے کے لئے تُلا بیٹھا تھا۔ مگر قدرت ہنسکر کہہ رہی تھی کہ یہ اُس وقت نہ مٹا جب چنگیز خاں کے خونخوار طوفانی حملوں نے مسلمانوں کی لاشوں سے دشت و جبل پاٹ دیئے، جب اس کے وحشی سپاہیوں نے مسلمانوں کی کھوپڑیوں سے فتح کے مینار تعمیر کئے۔ یہ اس وقت نہ مٹا جب ہلاکو نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ دنیا کی تمام قومیں ظلم و تشدد سے مٹ سکتی ہیں مگر مسلمان نہیں مٹ سکتے۔ یہ اسلام کے فرزند ہیں اور اسلام نے موت کو ایک نئی زندگی کا آغاز بتایا ہے۔ اسلامی سال کی ابتدا شہادتِ حسینؑ ہے اور انتہا ایثارِ ابراہیمی ہے

اِسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اُتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے (اقبالؔ)

(۲)

ہولناک نعروں، بندوقوں اور پستولوں کی آوازوں، نقاروں اور ڈھولوں کے شور میں رات گذر گئی۔ صبح ہوتے ہی چاروں طرف سکوت چھا گیا۔ ہر طرف فضا خاموش ہو گئی۔ لوگ نیند سے مجبور ہو کر سو گئے۔ کسی کھڑکی یا کواڑ تک کے کھلنے کی آہٹ نہیں تھی۔ ایک پُر ہول سنّاٹا ہر طرف مسلط تھا۔ اور کائنات کا ذرہ ذرہ خاموش۔ خالد، طارق اور نسیم مبہوت سے بیٹھے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ گو نیند کی وجہ سے ان کی آنکھیں بھی خمار آلود تھیں لیکن یہ اپنی ذمہ دارانہ حیثیت کی وجہ سے مجبوراً حقہ اور سگرٹ کی مدد سے وقت گذارنے میں مصروف تھے۔ محلّے کی رضاکار فوج کی طرف سے انھیں مورچے پر مقرر کیا گیا تھا۔ ہزاروں مسلمانوں کی حفاظت اُن کے ذمّے تھی۔ مکان سے سڑک صاف نظر آرہی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ان میں سے ایک اُٹھتا، ایک نظر میں اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتا اور پھر اطمینان سے اپنی جگہ آبیٹھتا۔ دشمن یہاں سے دور نہیں تھا۔ گرد و نواح کے گلی کوچے جہاں دشمن کثرت سے آباد تھے اس مسلم محلّے میں چاروں طرف سے آملتے تھے۔ ایک راستہ شہر کے بیرونی حصّے میں جا نکلتا تھا لیکن اس طرف دشمن فوج کے دستے گشت کرتے ہوئے گذرتے اور جہاں کہیں کوئی مسلمان نظر آتا گولی کا نشانہ بنا دیتے۔ ان سورماؤں کی آمد و رفت کے خوف سے بے نیاز ہو کر ہمارے یہ تینوں مجاہد اپنے مورچے پر بیٹھے کسی وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ اور ان میں سے ہر ایک جامِ شہادت نوش کرنے کا متمنی تھا۔ ایک طویل سکوت کے

بعد نسیم نے سلسلۂ کلام شروع کرتے ہوئے کہا:۔
"کیا تمہیں نیند آرہی ہے، اونگھ رہے ہو؟"
"بیشک کچھ نیند کا غلبہ سا ہے لیکن اب تو جنت ہی میں لمبی تان کر سوئیں گے۔ دشمن کی فقط ایک گولی ہم پر فردوس کے دروازے کھولنے کے لئے کافی ہے۔"
"اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم اپنے فرائض سے اکتا گئے ہو" نسیم نے طنزاً کہا۔
"وہ کیسے؟" خالد نے پوچھا۔
"بھائی جان ابھی تو امتحان کی ابتدا ہے اور ہمیں دشمن کے خرمنِ اُمید کے ایک ایک دانے کو جذبۂ ایمان کی بجلیوں سے پھونکے بغیر چارہ نہیں اور جناب ابھی سے ایک گولی کی آس پر جیتے ہیں۔ یوں کہو کہ دشمن کے بارود کے انبار ختم ہو جائیں گے مگر ہم اس وقت تک تازہ دم جئیں گے جبتک کہ کفر والحاد کے خس و خاشاک کو اپنے خون کے سیلاب سے نہ بہادیں گے۔ جبتک کہ اسلام کا ایک دشمن بھی زندہ ہے ہم پر جنت کا عیش و آرام حرام ہے۔"
طارق جو ابھی تک خاموش تھا اس نے دور سے کسی چیز کو دیکھ کر کہا "ہش چپ رہو دشمن بڑھ رہا ہے۔" نسیم اور خالد نے غور سے دیکھا تو واقعی اس خوفناک سناٹے میں دشمن کے ہزار بارہ سو سپاہی نہایت خاموشی کے ساتھ چوک کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اِدھر مسلمانوں میں ان تین مجاہدوں کے سوا اور کسی کو اس حملے کی خبر نہ تھی۔ اور نہ ہی انھیں جگانا مناسب سمجھا گیا تھا۔ ان تین شیروں کو یقین تھا کہ ہم اس لشکرِ طاغوت کو مار بھگائیں گے۔ دشمن کا یہ لشکر دو قطار کی صورت میں مکانات کی دیواروں کے ساتھ ساتھ قدم بہ قدم بڑھ رہا تھا۔ ان لوگوں کے پاس بندوقیں، بھالے،

نیزے سبھی کچھ تھا۔ ڈھول بھی تھے مگر خاموش۔ شاید اس لئے کہ انھیں خیال تھا کہ اگر ڈھول پیٹے گئے اور نعروں سے کام لیا گیا تو مسلمان ہوشیار ہو جائیں گے۔ وہ فرزندانِ اسلام پر بے خبری کے عالم میں ٹوٹ پڑنا چاہتے تھے۔ اُن کا پروگرام تھا کہ عین وسطِ چوک میں خاموشی سے پہنچ جائیں، پھر وہاں سے ایک دم گرد و نواح کے گلی کوچوں پر ٹوٹ پڑیں۔ تینوں شیروں نے اپنی کچھار میں بیٹھ کر ان گیدڑوں کے لشکر کو بڑھتے ہوئے دیکھا اور بندوقیں سنبھال لیں۔ خالد نے چاہا کہ فائر کرے لیکن طارق نے روک دیا۔

"بھائی اب تو وہ قریب آچکے ہیں۔ اگر چوک میں آہی پہنچے تو روکنا ناممکن ہو جائے گا۔ یہاں سے متعدد راستے اِدھر اُدھر کو کھلتے ہیں۔ ہم کس کس کی حفاظت کریں گے۔ ہمارے مسلمان بھائی تمام رات جاگنے کے بعد اب غفلت کی نیند سوئے ہیں۔ اگر یہ لوگ دشمن کے شور و غوغا سے بیدار بھی ہوئے تو اس اچانک حملے کو دیکھ کر گھبرا جائیں گے اور حیرانی پریشانی کی وجہ سے ہمارے لئے مفید ثابت نہ ہونگے۔" خالد نے طارق سے کہا۔

"گھبراؤ نہیں۔ ابھی دشمن چوک سے تین سو گز کے فاصلے پر ہے۔ میں مورچے سے نکل کر اسے وہیں روکتا ہوں۔ تم ابھی فائر نہ کرنا۔ ہاں یہ بھی سن لو کہ جب میں اشارہ کروں تو پھر توقف بھی نہ کرنا۔" طارق نے جواب دیا۔

"مگر بھائی آپ نیچے سڑک پر کیوں جا رہے ہیں۔ ان کی تعداد تو دیکھئے۔ کیا یہ خودکشی نہیں؟" خالد نے پھر پوچھا۔

"اس لئے کہ وہ یہ گمان نہ کریں کہ مسلمانوں میں سے کسی کو میدان میں نکل کر لڑنے

کی جرات ہی نہیں ہوئی۔ انھیں کیا معلوم کہ ہمارے لوگوں کو اُن کی آمد کا علم ہی نہیں اور وہ بے خبر سو رہے ہیں۔ دشمن تو یہی کہے گا کہ یہ لوگ جان بوجھ کر میدان میں نہیں آئے۔"

یہ کہتے ہی طارق بندوق سنبھالتا ہوا مورچے سے نکلا اور چشم زدن میں دشمن کے لشکر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ نعرۂ تکبیر کی آواز فضا میں گونجی اور ساتھ ہی گولی کی 'چٹاخ' سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی دشمن کی ایک لاش اوندھے منہ زمین پر گر پڑی۔ اس سے پیشتر کہ دشمن جواب دیتا طارق جلدی سے ایک جلے ہوئے مکان کے ملبے کی اوٹ لے کر لیٹ گیا۔ یہ نظارہ دیکھ کر نسیم اور خالد سے بھی نہ رہا گیا اور وہ بھی مورچے سے نکل کر ملبے اور اینٹوں کے انبار کی اوٹ میں ڈٹ گئے۔ دونوں طرف سے گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ دشمن کی اکثر گولیاں گھبراہٹ اور خوف کی وجہ سے گرد و نواح کی دیواروں میں الجھ کر رہ جاتیں اور مجاہدین کی ہر گولی نشانے پر بیٹھتی۔ طارق کہتا تھا کہ یہ سدھائی ہوئی ہیں۔ طارق سب سے آگے اور دشمن سے قدرے قریب تھا۔ خالد اور نسیم طارق سے تقریباً بیس تیس گز اِدھر تھے۔ خالد نے جو اچانک سر اٹھا کر دور کے کوٹھوں کی طرف نظر دوڑائی تو دیکھتا کیا ہے کہ ایک دشمن اپنے مکان کی کھڑکی سے طارق کی طرف فائر کیا چاہتا ہے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے بندوق داغ دی اور وہ بدبخت زخمی مرغابی کی طرح لوٹتا ہوا لشکرِ طاغوت کے درمیان آ گرا۔ یہی ایک بدنہاد اس مسلم محلے میں غیر مسلم تھا۔ اس وقت تک دشمن کے تقریباً پچاس افراد ہلاک اور زخمی ہو چکے تھے اور دشمن اپنے اصل مقام سے پیچھے ہٹ چکا تھا۔ اب لشکرِ طاغوت کا دم بلند

حصہ چوک کی مسجد کے قریب تھا اور اس مقام پر مسجد کا بغلی دروازہ کھلتا تھا۔ صدر دروازہ کی ڈیوڑھی چوک میں تھی۔ خالد نے محلے کے چند جوانوں کو جو بندوقوں کی چٹاخ پٹاخ سے بیدار ہو چکے تھے کچھ اشارہ کیا تو وہ فوراً تلواریں اور لاٹھیاں لے کر مسجد میں داخل ہو گئے اور بغلی دروازے سے دشمن کے لشکرِ بے پناہ پر ٹوٹ پڑے۔ بس پھر کیا تھا گیدڑوں کی یہ بزدل فوج سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ اٹھی۔ بارہ بندوقیں اور کوئی سو کے قریب لاشیں چھوڑ گئی۔ بھاگتا ہوا دشمن راستے کی تمام عمارتوں کو پھونکتا گیا حالانکہ یہ اسی کے بھائی بندوں کی ملکیت تھیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ دشمن کی تعداد ہزار بارہ سو کے قریب تھی اور ان میں سے کوئی تین سو کے قریب نئی قسم کے آلات سے لیس تھے۔ اس کے برعکس اسلامی محلہ میں صرف تین شکاری بندوقوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جس پارٹی کو پہرہ دینا ہوتا یہ بندوقیں اس کے حوالے کر دی جاتیں۔ باقی محض خدا کا فضل اور مسلمان کا جذبۂ ایمان تھا جس کی بدولت دشمن ذلیل ہو کر بھاگ جاتے تھے۔ جو لوگ آج دشمن کے ساز و سامان کو اہمیت دے رہے ہیں وہ بزدل ہیں اور نادانستہ طور پر پاکستان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کے ایمان کمزور ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ سہ

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تدبیریں نہ شمشیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں (اقبال)

ذوقِ یقین سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ساز و سامان بھی دھرا رہ جاتا ہے۔ اگر یہ ذوقِ یقین غلامی میں اتنا مفید ہے تو آزادی میں کتنا ہوگا۔ اب ہم

آزاد ہیں۔ اور ہمارے پاس تھوڑا بہت ساز و سامان بھی ہے۔ یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ دشمن کی بیس بندوقوں کے مقابلے میں ہمارے پاس صرف دس ہیں لیکن دنیا جانتی ہے کہ ہمارا بندوقچی رات کے اندھیرے میں سلگتے ہوئے سگرٹ کو نشانہ بنا سکتا ہے۔ اگر گذشتہ واقعات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جب فوج میں اتحاد، تنظیم اور ذوقِ یقین تھا وہ تعداد میں کم ہونے کے باوجود اور ساز و سامان کی کمی ہوتے ہوئے بھی بڑی بڑی عظیم الشان فوجوں پر غالب آئی۔ اگر مسلمان آج بھی یقینِ محکم اور عمل پیہم پیدا کریں تو انشاء اللہ بڑی سے بڑی طاغوتی طاقت ان کے قدموں پر جھک جائے گی۔ اللہ کو فقط مسلمان کے عزم اور عمل کی ضرورت ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مسلمان کے پاس جو کچھ بھی ہے قطع نظر اس سے کہ وہ تھوڑا ہے یا بہت لے کر میدان میں نکلے اور اس کی مدد کے لئے فرشتوں کو اتارنا خدا کا اپنا کام ہے۔ محض باتیں بنانا اور اپنے خوف اور بزدلی کو مصلحتوں کے پردوں میں چھپانا ایمان کی کمزوری ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہمیں خدا کی قدرت پر بھروسہ نہیں۔

خدا لاریب رب العالمیں ہے
مجھے خود قدرتِ حق کا یقیں ہے

خدا اُس کا مگر کیوں کر بنے گا؟
جو بیگانہ ہے خود اپنا نہیں ہے

دکی وارثی

آگ اور خون

(۱)

طارق، خالد اور نسیم جب معرکے سے فارغ ہوئے تو ہر طرف آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ دشمن کی شکست خوردہ فوج پسپا ہوتے ہوئے اردگرد کے مکانات پھونکتی گئی۔ اس کے علاوہ شہر کے دیگر علاقوں میں بھی دشمنوں نے سرکاری فوجوں کی مدد سے یہی کام شروع کر دیا۔ گھروں میں مقفل و مقید نہتے مسلمانوں کو اندر ہی اندر پھونک دینے کی پالیسی پر عمل ہونے لگا۔ مسلمان نہتے تھے اور بے یار و مددگار انھیں سوائے خدا کے کوئی سہارا نہ تھا لیکن اُنکا خدا اس وقت ان کا امتحان لے رہا تھا۔ دوسری طرف دشمن پورے ساز و سامان سے لیس تھے، حکومتِ وقت کی فوجیں انکی دستِ راست تھیں۔ مسلمان پولیس والوں کو اہانے بہانے غیر مسلح کر کے پاکستان

بھیجا جا رہا تھا۔ اسلامی محلوں میں دشمن سپاہیوں کے دستے کھلے بندوں پھر رہے تھے۔ کرفیو کی پابندی محض دکھاوا تھی۔ ہر طرف آگ اور خون کے خوفناک منظر پیش نظر تھے۔ مسلمانوں کے دروازے توڑے جاتے، اُن کی عورتوں اور مردوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر باہر لایا جاتا اور نہایت بے دردی اور بے حرمتی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا۔ جس مکان کا دروازہ توڑنے میں دقت ہوتی اُسے آگ لگا دی جاتی۔ غریب مظلوم مسلمان آگ سے بچنے کے لئے قریب قریب کے مکان پھلانگتے ہوئے ایک محلے سے دوسرے محلّے کی طرف نکل جانے کی کوشش کرتے اور اس کوشش میں کئی عورتیں اور بچے تین تین منزلہ عمارتوں سے گر کر چکنا چور ہو جاتے۔

آگ کا زور اور دشمن کے حملوں کا شور دیکھ کر شہر خالی ہونے لگا۔ خالد اور طارق اور نسیم کا محلہ بھی نصف سے زیادہ خالی ہو چکا تھا۔ طارق نے سوچا کہ اگر محلّے والے اسی طرح بے سوچے سمجھے کمیں گاہوں سے باہر نکلتے گئے تو ان میں سے شاید ایک بھی نہ بچ سکے۔ اس اندیشے کے پیش نظر اس نے خالد سے کہا کہ وہ ہسپتال کی دیوار پھاند کر اندر چلا جائے اور اس کی نگراں میم سے درخواست کرے کہ وہ محلے کے مظلوم مسلمانوں کو اپنی حدود میں پناہ لینے کی اجازت دے دے۔ شہر کے اس محلّے میں عرصہ دراز سے ایک زنانہ مشن ہسپتال چلا آتا تھا جس کی نگراں ایک یورپین لیڈی تھی۔ ہسپتال کا صدر دروازہ بڑی سڑک کی طرف تھا اور ایک چھوٹا بغلی دروازہ سڑک کے پہلو سے نکلتی ہوئی گلی میں کھلتا تھا مگر یہ ان دنوں بند ہی رہتا تھا۔ خالد نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو گلی سنسان تھی۔ کوئی لمحہ بھر پہلے یہاں سے بھوت ناچتے ہوئے گذرے تھے۔ لیکن اس وقت خاموشی تھی۔ خالد جلدی سے

نکلا اور ہسپتال کا بغلی دروازہ توڑنے لگا۔ دو چار چوٹیں پڑی تھیں کہ دروازہ ٹوٹنے کی بجائے کھل گیا۔ خالد نے جھانک کر دیکھا تو میم صاحبہ ہاتھ میں پستول لئے کھڑی تھیں۔ انھوں نے خالد کو پہچانتے ہوئے کہا :-

"ول ہم تمیں بلانا ہی چاہتا تھا۔"

"مہربانی" خالد نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا "آپ ہماری پرانی ہمسایہ ہیں اس لئے میں آپ سے درخواست کرنے آیا ہوں کہ بچے کھچے محلے والوں کو اپنی چار دیواری میں پناہ دیدیجئے۔"

"جلدی کرو۔ یہی تو ہم خود کہنے والا تھا" میم نے گھبراہٹ اور جوش کے ملے جلے لہجے میں جواب دیا۔

خالد نے فوراً طارق اور نسیم کو اطلاع دی اور انھوں نے اہلِ محلہ سے کہہ دیا کہ اگر جان بچانا چاہتے ہو تو اِدھر اُدھر بھاگنے کی بجائے ہسپتال میں چلے آؤ۔ دروازہ کھلا ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی بچوں بوڑھوں جوانوں کا جمِ غفیر گھروں سے نکل نکل کر آنے لگا۔ جو مکان بظاہر سنسان اور خاموش دکھائی دیتے تھے اُن کے آغوش میں سینکڑوں مظلوم صورتیں چھپی ہوئی تھیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے گلی کی جانب ہسپتال کا صرف ایک ہی چھوٹا دروازہ کھلتا تھا بس اسی دروازے کی طرف ہجوم لپکا۔ چند نوجوانوں نے کہیں سے دو تین سیڑھیاں بھی لا کر ہسپتال کی دیوار کے ساتھ لگا دیں۔ یہ دیوار کوئی بارہ فٹ اونچی تھی۔ مختصر یہ کہ جس جس سے جس طرح بن پڑا وہ ہسپتال کی چار دیواری میں داخل ہو کے رہا۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ بعض بزدل نوجوان سیڑھیوں پر چڑھتی ہوئی نوجوان عورتوں کو گھسیٹ کر نیچے اتار لیتے

اور خود چڑھنے میں پہل کرتے۔ عورتیں گھبراہٹ میں اپنے گود کے بچوں کو اچھال کر دیوار کے اندر پھینک دیتیں اور بعد میں خود داخل ہوتیں۔ طارق، خالد اور نسیم بندوقیں لئے اِدھر اُدھر ٹہلتے تاکہ کوئی دشمن حملہ نہ کر سکے۔ آخر بڑی افراتفری کے بعد یہ ہجوم ہسپتال میں پہنچ ہی گیا۔ اس مہم کو سر ہوئے ابھی ایک لمحہ ہی گذرا تھا اور ہمارے یہ تین مجاہد بھی اب دیوار پھاندنے کی فکر میں تھے کہ ایک سنسناتی ہوئی گولی خالد کے قریب سے گذری اور ساتھ ہی ایک بھینس خاک و خون میں لوٹتی ہوئی نظر آئی۔ ہمارے غازیوں نے وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے مردہ بھینس کی اوٹ میں پوزیشن لے لی۔ سامنے سڑک اور گلی کے مقامِ اتصال پر ایک جیپ کھڑی تھی جس میں چند دشمن سوار تھے۔ یہ گولی اسی جیپ سے آئی تھی جو حسنِ اتفاق سے بھینس کے جا لگی اور خالد بال بال بچ گیا۔ مجاہدوں نے پوزیشن لیتے ہی تڑاتڑ فائر کے رجن کے جواب میں دو تین اسٹن گنوں نے گولیاں برسانا شروع کیں۔ کسی طرف سے کسی قسم کے نعرہ کی آواز بلند نہ ہوتی تھی۔ فضا ساکت و خاموش تھی۔ وقفے وقفے کے بعد پٹ پٹ گولیاں چلتیں اور بس۔ کوئی گھنٹہ بھر یہ کھیل جاری رہا۔ آخر طارق کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور وہ ساتھیوں سے کچھ کہے سنے بغیر قریب ہی کے اس چھوٹے سے دروازے سے ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ مگر خالد اور نسیم وہیں ڈٹے رہے۔ طارق ہسپتال میں داخل ہونے کے بعد نہایت خاموشی سے دیوار کے اس حصہ پر چڑھ گیا جس کے قریب وہ جیپ کھڑی تھی اور 'یا علی' پکارتا ہوا دشمنوں پر کود پڑا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں صرف ایک خنجر تھا جس نے فوراً ہی ایک دشمن کا صفایا کر دیا۔ باقی بھگوڑے اس قدر سراسیمہ ہوئے کہ بھاگنے کے لئے جیپ سے کود گئے۔

اُن میں سے بھی دو کو خالد اور نسیم کی گولیوں نے گرالیا۔ باقی بھاگ نکلے۔ اپنا اسلحہ بھی وہیں چھوڑ گئے۔ طارق جوش میں جو اُٹھا تو اس کی نظر میں نسیم اور خالد کی پچھلی طرف گلی کے دوسرے سرے پر جا پڑیں۔ اس مقام سے گلی تین شاخوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ طارق کی نظر سیدھی ایک مکان کے دروازے پر رک گئی۔ یہاں سے دو دشمن دو نوجوان لڑکیوں کو جو شاید خوف اور ڈر کی وجہ سے مکان سے نکل کر ہسپتال میں داخل نہ ہو سکی تھیں اُٹھائے ہوئے بھاگنے میں مصروف تھے۔ طارق نے للکار کر نسیم کو خبردار کیا۔ وہ پلٹا اور اس کے ساتھ ہی دو فائر فضا میں گونجے۔ ایک گولی ایک معصوم لڑکی کی گردن سے گذر کر اس کے اُٹھانے والے کی پشت میں پیوست ہو گئی۔ دونوں دھڑ سے گرے اور ٹھنڈے ہو گئے۔ دوسرا نشانہ خطا ہو گیا مگر اس سے اتنا فائدہ ہوا کہ دشمن نے اپنی حفاظت کے پیشِ نظر دوسری دوشیزہ کو بھی پھینک دیا۔ تینوں مجاہد دوڑ کر قریب آئے تو دونوں بہنوں میں سے ایک شہید ہو چکی تھی۔ نسیم کی آنکھوں میں جس کی گولی سے یہ ہلاک ہوئی تھی آنسو آ گئے اور اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ طارق اور خالد نے شہیدہ کی لاش ایک چبوترے پر رکھ دی۔ اُس وقت اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ اب دشمنوں کے نعروں کی آوازیں قریب تر سنائی دینے لگیں۔

"میرا خیال ہے کہ دشمن ہجوم کی صورت میں اِدھر آ رہا ہے۔" خالد نے طارق سے کہا۔

"شاید اس ناہنجار نے جو نسیم کی گولی سے بچ کر گیا ہے انھیں بھیجا ہو" طارق نے کہا۔

"اُن کے متعلق بھی تو غور کرو جو جیپ سے نکل بھاگے ہیں جو تھے بھی سب کے سب فوجی۔ ممکن ہے انھوں نے ہجوم کو بھڑکایا ہو۔" نسیم نے کہا۔

"بہرحال اب ہمیں ہسپتال میں داخل ہو جانا چاہیئے۔ آؤ سب مل کر اس زندہ لاش کو اُٹھائیں اور ہسپتال میں داخل ہوں۔ اب دشمن کا شور بڑھ رہا ہے" خالد نے کہا۔

اس کے فوراً بعد انھوں نے اس نوجوان لڑکی کو جو ابھی تک بیہوش تھی اُٹھالیا اور چند منٹ میں ہسپتال کی چاردیواری میں داخل ہو گئے۔ میم صاحبہ جو ان کی شجاعت دیکھ چکی تھیں پہلے ہی سے دروازے پر موجود تھیں۔ ان کے داخل ہوتے ہی انھوں نے کواڑ مقفل کردئے اور ہمدردی سے کہا:۔

"او تم بہت بہادر ہے۔ ہم کو تمہارا بہت فکر تھا۔"

"ڈاکٹر صاحبہ پہلے اس لڑکی کو ہوش میں لاؤ پھر ہماری فکر کرنا" طارق نے کہا۔

"اس کو کوئی زخم تو نہیں آیا؟" لیڈی نے پوچھا۔

"نہیں، شکر ہے کہ یہ بے چاری میری گولی کا نشانہ نہیں بنی ورنہ ایک اور بے گناہ کا خون میری گردن پر ہوتا۔" نسیم نے جواب دیا۔

"پھر کوئی خطرہ نہیں۔ یہ صدمہ سے بے ہوش ہوگیا ہے" میم نے کہا۔

اس کے بعد چند ادویات سنگھائی گئیں۔ پندرہ بیس منٹ کی کوشش کے بعد لڑکی نے آنکھیں کھول دیں اور گھبرا کر پھر بند کرلیں۔

"گھبراؤ نہیں یہاں سب مسلمان ہیں اور تمہارے ہی محلے کے ہیں۔ دیکھو

یہ لوگ تم کو بچا کر لایا ہے۔ کھولو آنکھیں کھولو ڈرو نہیں۔" میم نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

لڑکی نے آنکھیں کھولیں اور طارق، خالد اور نسیم کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا "میری بہن، وہ کہاں ہے؟"

"وہ زخمی ہو گئی ہے اور ڈریسنگ روم میں زیر علاج ہے۔ ابھی تمہیں اس سے ملنے کی اجازت نہیں" طارق نے ہمدردی سے کہا۔

وہ بے چاری خاموش ہو گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ یہ کیفیت دیکھ کر سب کے چہروں پر اُداسی چھا گئی۔

(۳)

دوسرے دن صبح سویرے ہی ایک سکھ کپتان روڈ مارچ کرتا ہوا ہسپتال آیا۔ اُس کے ہمراہ چند سپاہی بھی تھے۔ اس نے دروازہ کے چوکیدار کی وساطت سے طارق کو طلب کیا۔

"بھائی! آپ نہ جائیے۔ شاید اُن کی نیت بُری ہو" سعیدہ (اس نوجوان لڑکی کا نام جسے کل بے ہوشی کی حالت میں اٹھا کر لایا گیا تھا) نے کہا۔

"نہیں میں ضرور جاؤں گا ورنہ وہ مجھے بزدل سمجھیں گے" طارق نے تن کر جواب دیا۔

"تم ابھی ادھر ٹھہرو۔ ہم خود اس سے بات کرتا ہے" لیڈی نے کہا اور دروازے کی طرف گئی۔

"آپ لوگ کیا چاہتا ہے؟ یہ انگریزی ہسپتال ہے اور ہم نے ان غریب

مسلمانوں کو پناہ دیا ہے۔ ہم کسی کو تمہارے حوالے نہیں کرے گا۔" ہیم نے ایک چھوٹی سی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کپتان سے کہا۔

"ہیم صاحبہ! آپ اطمینان رکھیں میں کسی کو گرفتار کرنے نہیں آیا اور نہ ہی دھوکے کی نیت سے آیا ہوں۔ میں صرف اس لئے آیا ہوں کہ آپ یہاں سے کسی ذمہ دار شخص کو میرے ساتھ بھیج دیں جو محلہ اسلام آباد کے مسلمانوں کو سمجھائے۔ یہ لوگ ابھی تک فائرنگ سے باز نہیں آتے جس کی وجہ سے دوسرے فریق مشتعل ہو رہے ہیں۔"

اس سے پیشتر کہ لیڈی کوئی جواب دیتی طارق لپک کر دیوار پر چڑھ آیا اور کہنے لگا "سردار جی معاف کرنا اب مسلم محلوں میں کوئی بھی نہیں ہوگا۔ کسی کا فائر کرنا تو در کنار!"

"نہیں جناب ابھی تک فائر کر رہے ہیں آپ چل کر دیکھ لیں۔" کپتان نے خالد سے کہا۔

"یہ محض ایک چال ہے جو آپ لوگوں نے ہمیں پھنسانے کے لئے بچھا رکھا ہے۔" طارق نے کہا۔

"واقعات ہی ایسے ہیں کہ آپ کو ہر شخص کی ذات پر شک کرنا پڑتا ہے۔ میں واہگورو کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں آپ کو فریب دینے نہیں آیا۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ جب تک میری جان میں جان ہے آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ اور میں آپ کو ابھی سلامتی کے ساتھ یہاں پہنچا دوں گا۔" کپتان نے طارق سے کہا۔

"آپ نے قسم کھائی ہے۔ مجھے ایک سپاہی کی قسم پر اعتبار ہے۔"

اتنا کہتے ہی طارق نے دیوار سے چھلانگ لگائی اور کپتان کے ساتھ چلا گیا۔ کوئی پانچ منٹ میں یہ لوگ محلہ اسلام آباد کے چوک میں تھے۔ یہ محلہ اسلام آباد کے عقب میں تھا۔ چاروں طرف آگ ہی آگ تھی۔ چند مکانات کے سوا باقی سب ایندھن بن چکے تھے اور جو باقی تھے اُن کی طرف بھی شعلے بڑھ رہے تھے۔ تپش کی وجہ سے چوک میں ٹھہرا بھی نہیں جاتا تھا۔ جا بجا مسلمانوں کی نعشیں، عورتوں اور بچوں کے جھلسے ہوئے ادھورے جسم بکھرے پڑے تھے۔ سڑاند کی وجہ سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ ان لاشوں اور سسکتے ہوئے نیم جانوں کے اردگرد دشمنوں کا ہجوم مختلف بھیس بدل کر پھر رہا تھا۔ ایک گروہ عوام کی صورت میں تھا اور ایک پولیس اور فوج کے لباس میں، اور ایک مصالحت کرانے والے معززین کے بھیس میں۔ طارق ہزاروں شہیدوں پر سے گذرتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں یہ لوگ جمع تھے۔ بعض اس سے واقف بھی تھے جنہوں نے بڑھ کر مصافحہ کرتے ہوئے یوں کہنا شروع کیا۔

"میاں جی آپ کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ ان مکانوں میں مسلمان ابھی تک ہتھیار نہیں ڈالتے جس کی وجہ سے ہمارے گبرو بھی طیش میں آجاتے ہیں۔ آپ انھیں سمجھائیں بجھائیں۔"

"ان خاموش مکانوں میں جن کے چاروں طرف آگ ہی آگ ہے کون ہوگا۔ پھر یہ بازاروں میں پڑی ہوئی لاشوں کے انبار صاف بتا رہے ہیں کہ زیادتی کس کی ہے۔ اگر اس علاقے کے مسلمان بھی گولی کا جواب گولی سے دیتے تو یہ صورت حال نہ ہوتی جو نظر آرہی ہے" طارق نے جواب دیا۔

"نہیں مہاراج پھر بھی باج (باز) نہیں آتے۔ آپ انھیں سمجھائیں"۔ ایک صاحب بولے۔

اتنے میں ایک نے کہا "وہ دیکھئے"۔ طارق نے دیکھا تو ایک نوجوان لڑکا بندوق لئے بزعم خود بڑی احتیاط سے بازار کی طرف جھانک رہا تھا اور شاید یہ سمجھتا تھا کہ میں سب کو دیکھتا ہوں مجھے کوئی نہیں دیکھتا۔ وہ طارق کو اچھی طرح سے جانتا بھی تھا۔ جب اُسے آواز دی گئی تو گردن نکال کر دیکھنے لگا۔

"رشید نیچے آجاؤ۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا"۔ طارق نے رعب سے کہا۔ چاروں طرف مکان جل رہے تھے اور آگ رشید کے مکان تک پہنچ چکی تھی۔ سیڑھیوں کا راستہ بالکل مسدود تھا۔ لہذا رشید نے پہلے تو اپنی بندوق پھینکی جو بازار میں گرتے ہی چور چور ہوگئی۔ بعد ازاں ایک مضبوط رسی کی مدد سے سڑک پر اُتر آیا۔ رشید نے بتایا کہ اب ان مکانات میں کوئی نہیں ہے۔ وہی اکیلا کبھی اس کھڑکی سے اور کبھی اس روشن دان سے فائر کرتا تھا اور دشمن کے بہادر سمجھتے تھے کہ سارا محلہ برسرِ پیکار ہے۔ رشید نے طارق کے کان میں کچھ کہا اور اس نے نزدیک ہی ایک کنویں میں جھانک کر دیکھا تو ایک عورت اور دو مرد لٹکے ہوئے نظر آئے۔ طارق نے انھیں تسلی دی اور اوپر آنے کو کہا۔ وہ نکل آئے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ پورے دو یوم سے اس کنویں میں چھپے ہوئے ہیں، بھوک سے نڈھال۔ طارق نے ان سب کو ساتھ لیا اور اُسی سکھ کپتان کی حفاظت میں ہسپتال کی راہ لی۔ روانگی کے وقت بعض لوگوں نے شرارت کرنا چاہی لیکن کپتان نے اشارتاً منع کر دیا۔ اِدھر ہسپتال میں بے تابی کے ساتھ انتظار ہو رہا تھا۔ یوں تو

سبھی متفکر تھے مگر نسیم کی بے چینی کچھ زیادہ ہی بڑھی ہوئی تھی۔ نہیں معلوم کیوں۔ جب کپتان اور طارق ہسپتال کے بڑے دروازے پر رُکے تو چند بدمعاشوں نے جو سڑک پر دوسری طرف سے آرہے تھے بلموں اور تلواروں کو اُچھالا مگر کپتان سچا سنگھ کی گارد نے وہیں ڈھیر کردئے۔ چند لمحوں کے لیئے ہر طرف سناٹا چھا گیا۔

طارق نے بڑے تعجب کے ساتھ کپتان کی طرف دیکھا اور کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ ابھی انسانیت مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی۔"

"نہیں، اور نہ ہوگی۔ ہماری قوم جو کچھ کررہی ہے وہ ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ مطلب پرستوں نے اپنے مفاد کے پیشِ نظر نتیجہ کو استعمال کیا ہے۔ افسوس ہمارے لیڈر دشمن کی چال کو نہیں سمجھے۔ وقت بتائے گا کہ ہم غلطی پر تھے۔ بس اب آپ اپنے ساتھیوں کو لے کر اندر جائیے۔ ہسپتال کی ڈاکٹر صاحبہ آپ کی منتظر ہوں گی۔"

اس کے بعد کپتان سچا سنگھ نے طارق اور اس کے ساتھیوں سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہوگیا۔ طارق نے دشمن کی لاشوں کو ایک نظر دیکھا اور ہسپتال کی دیوار پھاند کر دوسروں کے لئے دروازہ کھول دیا۔ سب سے پہلے جس شخص نے طارق سے ملاقات کی وہ نسیم تھا۔ اس کے بعد باقی سب۔ میم صاحبہ نے طارق سے کہا۔

"ہم کو تمہارا بہت فکر تھا۔ ان لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ اچھا ہوا تم آگیا۔ اب تم سب دو چار دن اِدھر آرام کرو۔ ہم تمہیں پاکستان بھیجنے کا انتظام کرے گا۔"

اس کے بعد میم صاحبہ نے ہسپتال کی تمام کوٹھریاں کمرے کھول دئے۔ پناہ گزین

مرد، عورتیں، بچے سب کے سب کہیں نہ کہیں اڈے جما کر پڑ رہے۔ یہ سب کے سب طارق، خالد، نسیم اور سعیدہ کو اپنا لیڈر سمجھتے تھے۔ رشید اور اس کے ساتھی لطیف، حمید اور رفیقہ بھی اس کے ممنونِ احسان تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر طارق محلہ اسلام آباد میں نہ پہنچتا تو ان کی جان بچنی دشوار تھی، آج کہیں بے گور و کفن پڑے ہوتے۔

خدا خدا کر کے یہ دن ختم ہوا اور شام کا وقت آیا۔ ان مظلوم پناہ گزینوں کا گروہ جو کئی دن سے تھکا ماندہ تھا ہسپتال کی پناہ کو غنیمت سمجھ کر محوِ خواب ہو گیا۔ طارق کی پارٹی بھی ایک کمرے میں تھک کر بیٹھ گئی۔ سعیدہ کی طرف دیکھ کر جو ایک طرف بیٹھی اونگھ رہی تھی خالد کو رحم سا آگیا اور اس نے طارق سے کچھ کانا پھوسی کی۔ جس کے نتیجہ کے طور پر طارق نے سعیدہ کو یوں مخاطب کیا۔

"سعیدہ بہن کیا یہ مناسب نہیں کہ تم بھی دوسرے لوگوں میں جا کر آرام کرو۔ دیکھو شاید تمہارے ماں باپ وہیں ہوں۔"

"ماں باپ، ان کی لاشیں تو میں خود جلتے دیکھ آئی ہوں اب تلاش سے کیا فائدہ۔ اس ہنگامے میں صرف میں اور میری بہن حمیدہ بچی تھیں مگر اب تو میں ہی تنِ تنہا ہوں۔" سعیدہ نے کہا۔

"نہیں تمہاری بہن تو ——— طارق کہنے لگا۔

"وہاں ڈریسنگ روم میں زیرِ علاج ہے۔ لیکن وہ ڈریسنگ روم ہسپتال میں نہیں، جنت کے کسی باغ میں ہو گا۔"

"ہیں؟" ——— نسیم کے منہ سے حیرانی میں نکلا۔

"ہاں، مجھے اب سب واقعہ یاد آگیا ہے کہ کس طرح دو شیطان ہمیں اٹھا کر بھاگے

اور آپ نے ان پر گولی چلائی جو سوءِ اتفاق سے میری پیاری حمیدہ کے جا لگی، اسے مرتے دیکھ کر میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ شروع میں آپ نے مصلحتاً یہ حقیقت مجھ سے چھپائی اور میں بھی بہ تقاضائے ضبط خاموش ہو گئی۔ اب تو راز کھل چکا ہے اور ظاہر ہے کہ اب روئے زمین پر میرا کوئی نہیں۔ میں آپ کا ساتھ چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتی۔ آپ میرے دینی بھائی ہیں۔ آپ کی خدمت مجھ پر فرض ہے اور میری حفاظت آپ پر فرض۔ اب میرا کوئی نہیں۔" وہ رونے لگی۔

نسیم نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا کہ ہم سب ایک ہی طرح کے ہیں۔ ہمارے ماں باپ بھی خدا کو پیارے ہو چکے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ہم خود بھی موت کی تلاش میں مصروف ہیں۔ شاید ہمیں بھی وہ مل جائے۔ طارق نے بتایا کہ سارے خاندان سے ہم تین بمشکل بچے ہیں مگر بچنا نہیں چاہتے۔ جہاں تک ممکن ہو گا لڑیں گے اور مرنے سے جی نہ چرائیں گے۔ آگے اللہ کی مرضی۔

رشید اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے بھی طارق کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ طارق نے انھیں "اصحابِ چاہ" کا لقب دیا۔ یہ وہ تھے جنھیں کنوئیں سے نکالا گیا تھا۔ ان میں رفیقہ رشید کی خالہ تھی اور حمید خالو۔ لطیف حمید کا بھائی تھا۔ ہمسایہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ طارق، خالد اور نسیم کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کا محلہ مسلم آباد کے عقب میں تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد جب دل کا بخار ہلکا ہو گیا تو سب کو بھوک ستانے لگی۔ مرد تو خیر، لیکن عورتیں شدت سے تکلیف محسوس کرنے لگیں۔ اُدھر دوسرے پناہ گزینوں کے وفد نے بھی اپنے نوعمر لیڈر طارق کو اس ضرورت سے آگاہ کیا اور اس نے بہ امرِ مجبوری ہیم صاحب سے کہا۔

"تمہارے کہنے کی ضرورت نہیں ہمیں خود ہی فکر ہے انتظام ہو رہا ہے۔ ہسپتال میں جس قدر خوراک کا سامان موجود ہے سب تمہیں دیدیا جائے گا۔ تم آرام سے بیٹھو۔ بار بار کمروں سے باہر مت نکلو شہر جل رہا ہے۔ دشمن کی فوجیں مسلمانوں کا خاتمہ کر رہی ہیں۔ وہ دیکھو خوفناک نعرے سنائی دے رہے ہیں۔ بم اور گولیاں چل رہی ہیں۔ جاؤ آرام سے بیٹھو سب کچھ وہیں پہنچ جائے گا۔"

طارق مطمئن ہو کر آیا ہی تھا کہ ہسپتال کے ملازم روٹی دودھ وغیرہ خوان میں لگا کر لائے۔ طارق نے کہا پہلے عوام کو کھلایا جائے ہم بعد میں کھائیں گے۔ ملازم نے بتایا کہ عام لوگوں میں کھانا پہنچ چکا ہے آپ بھی تناول فرمائیے۔ ان کے اصرار پر اصحاب جاہ اور طارق پارٹی نے بھی کھانا شروع کیا۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو سب کے سب اونگھنے لگے۔ مگر طارق، خالد اور نسیم بندوقیں لئے باہر برآمدے میں ایک تاریک جگہ پر آ بیٹھے۔ شہر بھر کے مکانات جل رہے تھے۔ آسمان پر دور دور تک روشنی دکھائی دیتی تھی۔ خوفناک آوازوں، پرجوش نعروں سے دل لرز رہے تھے۔ بندوقیں ہچکیاں لے رہی تھیں۔ بم کھانس رہے تھے۔ ہسپتال کے باہر سڑک پر بھاری بھرکم فوجی گاڑیوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ زخمیوں کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کہیں کہیں ان چیخوں سے ملے جلے قہقہے بھی سنائی دیتے تھے۔ طارق نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کہا کائنات آگ اور خون کے سمندر میں ڈوب رہی ہے۔

تصادم سے حذر کرنا ہی بہتر ۔۔۔ دل بیباک کا ڈرنا ہی بہتر
جو ہو زندہ ترے مرنے سے ملت ۔۔۔ تو اے بزدل ترا مرنا ہی بہتر

(دلی وارثی)

سفر

(۱)

جب رات نصف کے قریب گذر گئی تو میم صاحبہ طارق کو تلاش کرتی ہوئی آئیں۔ وہ گھبراہٹ اور بیتابی سے اس کمرے کی طرف لپکیں جہاں یہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ طارق اپنے ساتھیوں کے ساتھ برآمدے ہی میں تھا۔ اُس نے قدموں کی چاپ سنی اور چوکنا ہو گیا۔ پھر قریب سے پہچان کر بولا۔

"کیوں ڈاکٹر صاحبہ خیر تو ہے؟"

"او تم باہر ہی بیٹھا ہوا ہے۔ ہم تمہیں تلاش کرنے کمرے میں جا رہا تھا۔"

"کیوں کیا بات ہے؟"

"تمہارے سفر کا بندوبست ہو گیا ہے۔ چلو جلدی سب کو اطلاع دو بٹڑی

ٹرک باہر کھڑے ہیں۔ اب تم سب لوگ جا سکتا ہے۔ ہم نے شام کو چھاؤنی میں فون کر دیا تھا۔"

طارق اُٹھا۔ اس نے سب سے پہلے اصحاب جاہ کو جگایا۔ پھر تمام پناہ گزینوں کو اطلاع دی۔ سب کے سب ہم ہما کر اُٹھے اور افراتفری کے عالم میں ہسپتال کا دروازہ کھول کر ٹرکوں کی طرف لپکے۔ نہ باپ کو بیٹے کا خیال تھا نہ بیٹے کو ماں کا۔ نہ خاوند کو بیوی کی فکر تھی نہ بیوی کو خاوند کی۔ جس جس کو جہاں جگہ ملتی تھی بیٹھ رہا تھا۔ طارق اور اس کے ساتھی الگ کھڑے دیکھ رہے تھے۔ ان سے کوئی نہیں کہتا تھا کہ بھئی لیڈر صاحب تم نے اپنی جان پر کھیل کر ہماری جان بچائی ہے آؤ پہلے تم بیٹھو ہم بعد میں بیٹھیں گے مگر کہاں۔ سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ اس افراتفری کے عالم میں بعض حضرت ایسے باہوش بھی تھے جو اپنے ردّی سے اٹیچی کیس کو کسی کے عمدہ سے سوٹ کیس سے بدلنے کی کوشش میں پھر رہے تھے۔ اور بعض نے تو یہ بھی کیا کہ دوسرے کے بکس کا مال نکال کر اپنے بکس میں ڈال لیا۔ باتونی نوجوان جو آج ڈینگیں مارتے پھرتے ہیں نوجوان بہو بیٹیوں کو پہلے سوار کرانے کی بجائے خود اُچھل اچھل کر سوار ہو رہے تھے۔ سنا ہے کہ قیامت میں لوگ نفسی نفسی پکاریں گے۔ بس یہی کیفیت اس قیامتِ صغریٰ میں دیکھی گئی۔ آخر یہ ہوا کہ تمام کے تمام ٹرک بھر بھرا کر رخصت بھی ہو گئے اور اصحاب جاہ اور طارق اینڈ کو ٹک ٹک دیکھتے رہے۔ لیڈی صاحبہ بیچاری نے جوں توں کر کے ایک اور ٹرک منگایا اور ان لوگوں کو بھی سوار کرا دیا۔ اب یہ بالکل نہتے تھے۔ ان کی جو دو چار بندوقیں تھیں وہ ہسپتال ہی میں رکھ لی گئی تھیں۔ ایسے یہ مطمئن تھے کہ اب ہمیں پاکستان پہنچا دیا جائے گا۔ ٹرکوں کا قافلہ

شہر سے نکلتے ہی ایک ایسی سڑک کی طرف ہولیا جو پاکستان کی بجائے کفرستان کے ایک اندرونی ضلع کی طرف جاتی تھی۔ گاڑی کا رُخ بدلتا دیکھ کر طارق نے محسوس کرلیا کہ ان کی نیت درست نہیں۔ طارق نے چاہا بھی کہ اس نائک سے جو ڈرائیور کے پہلو میں اسٹن گن سنبھالے بیٹھا تھا دریافت کرے لیکن نسیم اور خالد نے اشارتاً منع کر دیا۔ انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس حولدار کے منہ سے جو پچھلی طرف انہی کے پاس بیٹھا اونگھ رہا تھا دیسی شراب کی بو آرہی ہے۔ طارق نے اندازہ لگایا کہ رات کی بے آرامی اور شراب کے نشے نے اُسے مدہوش کر دیا ہے۔ اُن سے پہلے چلے ہوئے ٹرک کافی فاصلہ پر جا رہے تھے۔ تمام سڑک اُجاڑ اور خاموش تھی۔ اس نے رشید، خالد اور نسیم کے کان میں کچھ کہا اور کوئی لمحہ بھر کے ہی بعد شرابی سے بندوق چھینتے ہی اسٹن گن والے نائک پر گولی چلا دی۔ اور ساتھ ہی لطیف اور حمید نے ڈرائیور پر قابو پا کر گاڑی کھیتوں میں آتارلی۔ کھیتوں میں ایک گڑھا کھود کر تینوں ملعون اس میں دفن کر دیے گئے۔ رشید نے کہا کہ انھیں جلا دیا جائے لیکن نسیم نے بتایا کہ ایسا کرنے سے آگ کے شعلے گرد و نواح کے دیہات کو اس طرف متوجہ کر دیں گے اور بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ دشمنوں کو نیست و نابود کرنے سے پہلے اُن کی وردیاں اتار کر طارق، خالد اور نسیم نے پہن لیں۔ اور یہ قافلہ اسی گاڑی میں جوں کا توں روانہ ہوگیا۔ پارٹی میں سے کسی نے تجویز پیش کی کہ اب واپس چلنا چاہیئے تاکہ پاکستان کا رُخ کریں لیکن طارق نہ مانا۔ اس نے کہا کہ ہمارے جو ساتھی پہلے ٹرکوں کے ذریعہ خطرے کی حدود تک پہنچ چکے ہیں انھیں بچانا ضروری ہے۔ اس لئے اسی جانب بڑھتے چلے جانا چاہیئے۔ لہٰذا یہ لوگ بدستور

اسی طرف بڑھتے چلے گئے۔

اب ذرا اُن کی سنئے، جو سب سے پہلے روانہ ہو چکے تھے۔ تقریباً دو گھنٹے سفر کرنے کے بعد یہ قافلہ پاکستان سے کافی دور کفرستان کی اندرونی وسعت میں پہنچا دیا گیا۔ چونکہ سفر کا آغاز رات کے اندھیرے میں ہوا تھا اس لئے بدنصیب مسلمانوں کو یہ علم ہی نہ ہو سکا کہ ہمیں مکاری سے غلط راستے پر لے جایا جا رہا ہے۔ اگر معلوم ہوتا بھی تو بھی وہ کیا کر سکتے تھے، نہتے، مجبور و لاچار جن کی پشت پر کوئی مضبوط حکومت نہ تھی۔ کسی قوم کی فوج بطور مددگار یا محافظ ہمراہ نہیں تھی اور جو سپاہی ساتھ تھے وہ اُسی قوم کے افراد تھے جن کی کینہ پروری کی بدولت آج انھیں گھروں سے نکالا گیا تھا۔ ان سے کسی امداد کی امید رکھنا حماقت تھی۔ کوئی دو گھنٹے کے سفر کے بعد طلوع آفتاب سے کچھ پہلے ایک مقام پر یہ قافلہ رکا۔ مجبور و لاچار لوگوں نے نظرِ دوڑا کر دیکھا تو ارد گرد لاتعداد مشعلوں کا ہجوم پایا۔ دشمن نیزوں، بھالوں، تلواروں اور بندوقوں سے مسلح کوئی دس بارہ ہزار کی تعداد میں کھڑے تھے۔ لیکن بالکل سنّاٹا تھا۔ ڈوگروں نے جو قافلے کے محافظ تھے اپنی مجبوری اور بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے ٹرکوں سے اتر جانے کا حکم دیا۔ بس پھر کیا تھا بدنصیب مسافر جو بزعمِ خود موت کے منہ سے بچ نکلے تھے بے بسی کے عالم میں فوجی گاڑیوں سے اُترے۔ اُن میں سے اکثر بدحواس ہو چکے تھے۔ لہٰذا کئی مائیں اپنے بلکتے بچوں کو ٹرکوں ہی میں بھول گئیں اور کئی نو عمر بدحواسی سے اترنے والوں کے پاؤں تلے کچلے گئے۔ دشمن کے کارکنوں نے عورتوں اور مردوں کو الگ الگ قطاروں میں کھڑا کیا۔ عورتوں میں سے نوجوان لڑکیوں اور مردوں میں سے نوجوان لڑکوں کو چن کر بدفعلی

کا حکم دیا۔ اور یہاں اوسان خطا تھے کہ کیا کریں کہاں جائیں۔ جب انھوں نے انکار کیا تو جیکارے لگاتا ہوا ایک ہجوم ان معصوم لڑکیوں اور عورتوں پر ٹوٹ پڑا۔ اب سناٹا ہنگامے میں بدل چکا تھا۔ دشمنوں کے قہقہے جیکارے اور مظلوموں کی چیخ و پکار کی ملی جلی آوازیں فضا میں گونجنے لگیں۔ مردوں کو توچن چن کر موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ مشعلوں سے لاشیں جلادی گئیں۔ مشعلوں کا دھواں، فریادوں کا شور، ظالموں کا ظلم، فاسقوں کا فسق و فجور بھی خدا کے فرشتوں کو زمین پر اترنے کیلئے آمادہ نہ کرسکے۔ نہیں معلوم کن مصلحتوں کی بنا پر خدا نے یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھا۔ قافلے میں بہت سے ایسے بھی تھے جن کی زبان پر ورد جاری تھے جن سے بلائیں ٹل جاتی ہیں مگر افسوس ان وظائف کے مؤکل مدد کو نہ آئے۔ اس کے وجوہ کیا ہیں؟ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ؎

خدا نے آجتک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا (مولانا ظفر علیخان)

خدا قرآن میں بار بار فرماتا ہے منظم رہو، سپاہی بنو، دشمن کے مقابلے کے لئے گھوڑوں کی چھاؤنیاں قائم کرو تاکہ خدا کے دشمنوں پر تمہارا رعب طاری ہو۔ ہمارے لوگ ان اشارات کو فراموش کر چکے تھے۔ ملک میں کوئی ایسی تنظیم نہ تھی جو اس مصیبت کے وقت کام آتی۔ خدا کے ایک بندے نے برسوں کی محنت سے خاکساروں کے نام سے مسلمانوں کو منظم کیا تھا۔ شہر بہ شہر، قریہ بہ قریہ خاکسار سپاہی بہترین منظم صورت میں موجود تھے جو ان انقلابی ایام میں بے حد مفید ثابت ہوتے، مستورات کو بہ حفاظت نکالتے، بچوں کو بچاتے، بوڑھوں کو اُٹھاتے اور دشمنوں

کے دانت کھٹے کر دیتے۔ مگر وائے قسمت وہ اپنے ہی لیڈر کی جذباتی اغلاط کی بدولت ختم ہو چکے تھے۔

(مذکورہ بالا خیالات کا یہ مطلب نہیں کہ راقم الحروف وظائف کی برکت کا منکر ہے۔ مانتا ہوں کہ ان میں خیر و برکت ضرور ہے لیکن قوم کی اجتماعی ترقی اور طاقت کے لئے متحدہ عمل کی سخت ضرورتیں پیش آیا کرتی ہیں۔ قرآن پاک میں ایسے بے شمار احکام موجود ہیں۔)

خاکسار جماعت ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھی۔ بہترین نوجوان بہترین تربیت سے آراستہ تھے۔ ان دنوں یعنی ۱۹۴۷ء کے انقلابی دور میں گو ہماری بلوچ اور دوسری مسلمان فوجیں برصغیر ہند سے باہر تھیں پھر بھی خاکساروں کی موجودگی انکی عدم موجودگی کی تلافی کے لئے کافی ہوتی۔ ۱۹۴۰ء میں خاکسار کا زور دیکھ کر حریفوں نے بھی اپنی جماعتیں تیار کیں اور سر سکندر مرحوم نے جو اس وقت پنجاب کے وزیر اعظم تھے ان فوجی نوعیت کی جماعتوں پر پابندی لگا دی۔ حریف دانشمند تھے وہ بظاہر خاموش ہو رہے مگر در پردہ تیاریاں ہوتی رہیں اور ادھر سادہ لوح مگر جذباتی خاکسار حکومتِ وقت سے ٹکرا کر موت کی نیند سو گئے۔ دشمن چاہتا بھی یہی تھا۔ انھیں بٹوا کر خود بچا رہا۔

ع وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا

جب سورج طلوع ہونے لگا تو اس کا رنگ سرخ انگاروں کی طرح تھا۔ شاید وہ بھی اس خون کے طوفان میں ڈوب کر نکلا تھا۔ اب نہ وہاں ڈوگرے تھے اور نہ کوئی اور۔ خون میں لتھڑی ہوئی لاشیں، سوختہ اور نیم سوختہ جسم، کٹے

ہوئے اعضا، بعض نیم مردہ کراہتی ہوئی عورتیں اور بچے انسان نما درندوں کی بربریت کے ثبوت میں پڑے تھے۔ یہ اس قوم کی "بہادری" کا ثبوت تھا جس نے ہندوستان سے باہر کبھی ایک قلعہ بھی فتح نہیں کیا، جو صدیوں عربوں، افغانوں، مغلوں اور انگریزوں کی غلام رہی اور جس قوم نے ہمیشہ حیوانوں کو انسانوں پر ترجیح دی۔ سانپ کو پوجا، لیکن برصغیر کی دوسری اقوام کو اچھوت سمجھا۔ گائے کا پیشاب پیا لیکن انسانوں کے گھروں کا پانی پینے سے نفرت کی۔

طارق اپنے ساتھیوں سمیت جب اس مقام پر پہنچا تو سعیدہ کی چیخ نکل گئی۔ چاروں طرف کشتوں کے پشتے لگے ہوئے تھے۔ نسیم نے لپک کر سعیدہ کو سنبھالا۔ دیکھا تو وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ ہوش میں لانے کی کوشش کی گئی۔ نسیم تو اِدھر مصروف ہو گیا، خالد، طارق، رشید، لطیف اور حمید سب کے سب گاڑی سے اُتر گئے۔ ظلم و ستم کا یہ خوفناک نقشہ دیکھ کر ان کے دل رو رہے تھے۔ پھر بھی ضبط سے کام لیتے ہوئے ایک ایک نیم بسمل کا معائنہ کرنے لگے۔ جس میں ذرا بھی زندگی کے آثار پائے جاتے اُسے بچانے کی کوشش کرتے لیکن اتنی لاتعداد مردہ اور نیم مردہ لاشیں پڑی تھیں کہ ان سب کی طرف متوجہ ہونا ناممکن تھا۔ پھر بھی یہ ایک ایک نظر سب پر ڈالتے گئے۔ اس جگہ سے کوئی دو میل کے فاصلے پر ایک گاؤں دشمنوں کا مرکز تھا جہاں ایسے ٹولے موجود رہتے تھے جن کے ذمے مسلم قافلوں کو ٹھکانے لگانے کے فرائض تھے۔ جب یہ طاغوتی دستے اپنی کارگذاری کے بعد گاؤں کی طرف لوٹ جاتے تو چند حواریوں کو جاسوسی کے لئے چھوڑ دیتے اور یہ جاسوس کسی نئے شکار کی ٹوہ میں لگے رہتے۔ اس وقت بھی دو جاسوس کھیتوں

میں چھپے ہوئے تھے۔ انھوں نے فوراً خبر دی کہ تین ڈوگرے ایک فوجی گاڑی میں مسلمانوں کو لائے ہیں جن میں عورتیں بھی ہیں۔ پھر کیا تھا۔ گاؤں سے ڈیڑھ سو کے قریب ایک جتھہ حملے کے لئے نکلا۔ وہ جانتے تھے کہ ڈوگرے خود ہی مسلمانوں کو مروانے کے لئے اِدھر لاتے ہیں اور فسادیوں کو روکتے ٹوکتے بھی نہیں۔ سعیدہ ہوش میں آچکی تھی۔ نسیم اب بھی اُسے تسلی دے رہا تھا اور اصحاب چاہ یعنی رشید اور اس کے ساتھی طارق اور خالد کے ساتھ لاشوں میں پھر رہے تھے۔ رفیقہ بے چاری برہنہ عورتوں کے ستر ڈھانپ رہی تھی کہ قریب سے ایک کھیت میں بندوق چلنے کی آواز آئی۔ گولی سیدھی رفیقہ کی چھاتی میں پیوست ہوگئی۔ نسیم نے فوراً اپنی رائفل سنبھالی جو راستے میں اونگھنے والے حولدار سے چھین لی گئی تھی۔ سعیدہ ٹرک میں اوندھی لیٹ گئی۔ تقریباً دس آدمیوں کا ایک جتھہ کھیتوں کی طرف سے بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ لوگ بلا تکلف بڑھ رہے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ مسلمان نہتے ہوتے ہیں۔ نسیم نے فوراً ٹرک سے کود کر ایک درخت کی اوٹ لیتے ہوئے فائر کیا جو ایک کافر کی کھوپڑی اڑاتا ہوا نکل گیا۔ اب دشمن کے قدم رُک گئے۔ انھیں اس خلافِ توقع سلوک پر حیرت ہوئی۔ وہ تو نہتوں پر حملہ کرنے کے عادی تھے اور یہاں معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ اب وہ بھی پوزیشن لے کر ڈٹ گئے۔ فائروں کی آواز سے طارق اور رشید بھی متوجہ ہوئے۔ اُن کے پاس اسٹن گن تھی۔ طارق نے دور سے پکار کر کہا۔

"نسیم ڈرنا نہیں میں آرہا ہوں"

نسیم نے یہ سنا اور جواب دئے بغیر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس وقت دونوں

طرف سے فائر ہو رہے تھے۔ نسیم کو لطیف اور حمید کی تلاش تھی اور وہ کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ اب دشمن جتھے دونوں جانب سے بڑھتے ہوئے دکھائی دیے۔
طارق نے جواب قریب آچکا تھا ایک طرف رشید اور نسیم سے کنٹرول کرنے کے لئے کہا اور دوسری طرف جدھر دشمنوں کا زور تھا خود متوجہ ہو گیا۔ اس ہنگامے میں نسیم نے ایک بار پھر لطیف اور حمید کو چیخ چیخ کر پکارا لیکن بے فائدہ۔ ویسے بھی اس کی آواز نحیف تھی۔ جواب میں دشمن کے جیکاروں کا شور سنائی دیا اور کچھ نہیں۔ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک یہ جنگ جاری رہی۔ مجاہدوں نے متعدد کافروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا حتیٰ کہ یہ لوگ بھاگنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ طارق اور خالد نے دکھاوے کے طور پر چند قدم تک تعاقب کیا پھر لوٹ آئے۔ واپسی پر جب اپنی پارٹی کا جائزہ لیا گیا تو رفیقہ شہید اور لطیف اور حمید لاپتہ تھے۔ قیاس کیا گیا کہ وہ بھی شہید ہو چکے ہیں۔ اب انکی لاشیں تلاش کرنا فضول ہے۔ نسیم نے ذرا خوشی میں کہا۔

"دشمن بھاگ گئے۔"

"ہاں بھاگنا ہی تھا انہیں۔ یہ نہتوں ہی سے لڑ سکتے ہیں۔ افسوس اصحابِ جاہ کی پارٹی ختم ہو گئی۔ خالد ذرا رفیقہ کی لاش اس جھاڑی میں چھپا دو۔ ہم دفن نہیں کر سکتے تو کم از کم اتنا ہی کر دیں۔" طارق نے کہا۔ رشید اور خالد نے تعمیل کی۔

"اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ دشمن کوئی اور شرارت کرے" نسیم نے کہا اور اس کے ساتھ ہی سب گاڑی میں بیٹھ گئے۔

"اب چلنا کدھر ہے؟" خالد نے پوچھا۔

"موت کی تلاش میں۔" طارق نے جواب دیا۔

"پاکستان نہیں؟" رشید نے کہا۔

"پاکستان اب یہاں سے ستر اسی میل کے فاصلے پر ہے اور گاڑی میں اتنا پٹرول نہیں۔ تھا تو کافی لیکن راستے میں شاید ٹپکتا رہا ہے۔ اگر میں یہاں غور نہ کرتا تو ایک بوند بھی نہ بچتی۔ اس کے علاوہ موجودہ جھڑپ نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ہم نقلی ڈوگرے ہیں اصلی نہیں۔ راستے میں گرفتاری کا اندیشہ ہے" طارق نے کہا۔

"آخر سوچا کیا ہے جناب نے؟" خالد نے سوال کیا۔

"سوچا یہ ہے کہ یہاں سے تقریباً دس بارہ میل کے فاصلے پر پریم نگر ایک قصبہ ہے جس میں ایک متمول زمیندار چودھری محبت رائے سے میرے والد مرحوم کے بہت مراسم تھے اور وہ انھیں بھائیوں کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ میں یہاں شکار کے موسم میں اکثر آیا کرتا تھا۔"

"اور اب خود شکار ہونے چلے ہو!" خالد نے طنزاً بات کاٹ کر کہا۔

"بھائی شکار تو ہم پہلے ہی ہو چکے ہیں۔ اور پھر جو موت کی تلاش میں پھر رہا ہو اُسے دل میں یہ خیال ہی نہ لانا چاہیئے۔" طارق نے جواب دیا اور گاڑی چلا دی۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا۔

"مجھے یقین ہے محبت رائے ہماری مدد کریں گے اور ہمیں پاکستان بھی پہنچا دیا جائے گا۔"

"اچھی بات ہے چلو جلدی چلو۔ ایسا نہ ہو کہ دشمن پھر آ جائیں" سعیدہ

نے درخواست کی اور طارق نے گاڑی کی رفتار تیز کردی۔

قطرہ طوفان میں گر کر ہی گہر بنتا ہے
دانہ جب خاک میں ملتا ہے شجر بنتا ہے
جھونک دیتا ہے مصائب میں جو انسان خود کو
بیشۂ رزم کا وہ شیرِ ببر بنتا ہے

(وَلی وارثی)

محبت رائے

(۱)

پریم نگر ایک خوبصورت قصبہ تھا، ایسے دریا کے کنارے جس کا پانی کبھی خشک نہیں ہوتا تھا۔ سردیوں میں بھی اس کی متلاطم موجیں وجد و سرور میں جھومتی رہتی تھیں۔ پریم نگر کی آبادی دس بارہ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ یہاں کبھی مسلمان بھی ہوتے تھے اگرچہ تھوڑے۔ سکھ اور ہندو کثرت سے آباد تھے۔ لیکن وہ اپنی اکثریت کے باوجود مسلمانوں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے اور اُن کے جذبات کا پورا پورا احترام کرتے تھے۔ نوجوانوں میں کوئی جھگڑا اُٹھتا تو بڑے بوڑھے اپنے ہی بچوں کو جھٹلاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ فتنہ پیدا ہوتے ہی موت کی آغوش میں سو جاتا۔ مسلمان ہندو سکھ بیاہ شادی اور رسم و رواج کے معاملہ میں ایک دوسرے کا ہاتھ

بٹاتے۔ شادی وغم میں شریک ہوتے۔ اگر لال چند کی لڑکی کی شادی ہوتی تو دین محمد اپنے فرائض اس طرح انجام دیتا گویا کہ خود اسی کی دختر کا نکاح ہے۔ میل ملاپ، لین دین میں کوئی کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ اگر لال چند سن پاتا کہ دین محمد کو اپنے کسی بچے، بچی کا بیاہ کرنا ہے تو خاص طور پر ملنے آتا اور کہتا:۔

"شیخ جی کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف بتا دینا اور جھجکنا نہ کرنا۔ میں ہر طرح حاضر ہوں۔"

وہ زمانہ پرانا تھا۔ لوگ پرانے تھے۔ گو بظاہر پرانے رسم ورواج کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک جگہ کھاتے پیتے نہیں تھے پھر بھی ایک دوسرے کی محبت کے نشے میں سرشار تھے۔ موجودہ دور کی طرح نہیں کہ ہندو مسلمان اپنے اپنے مذہب سے بے نیاز ہو چکے ہیں، مغربی تہذیب کے زیرِ اثر لہو ولعب کی محفلیں ہیں۔ ایک ہی برتن میں کھانا پینا ہے۔ بہ ایں ہمہ دلوں میں بغض وعناد کی آگ سلگ رہی ہے، ایک دوسرے کو تباہ وبرباد کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ بغل میں چھری اور زبان پر رام نام ہے۔

القصہ پریم نگر میں گذشتہ زمانہ کی یاد چند بزرگ ہستیاں تھیں جن میں ایک چودھری محبت رائے بھی قابلِ قدر انسان تھے۔ کبھی محبت رائے اور طارق کے والد میں گاڑھی چھنتی تھی۔ دونوں بھائی بھائی بنے ہوئے تھے۔ اسی تعلق کے پیشِ نظر اس چھوٹے سے قافلے نے اِدھر کا رُخ کیا۔

"ان دنوں بڑے بڑے دوست ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔ آپ کا خیال شریف میں؟ کہیں محبت رائے کی محبت کا پول نہ کھل جائے" رشید نے طارق سے کہا۔

"پریم نگر یا کسی اور ڈگر پر چلے جائیں ہم خطرے سے محفوظ نہیں، تو پھر ایسی صورت

میں ایک شریف دوست کی شرافت کیوں نہ پرکھی جائے۔ اچھے اور بُرے کی پہچان کا یہی وقت ہے جس میں جتنا کھوٹ ہوگا ضرور ظاہر ہو کر رہے گا" طارق نے جواب دیا۔

"اچھا، جیسے حضور کی مرضی" خالد نے طنزاً کہا۔

"حضور کی نہیں قسمت کے فتور کی مرضی کہو" طارق نے جواب دیا۔

دور سے چند مکانوں کی اونچی اونچی دیواریں جو درختوں کے جھنڈ سے گردن نکال نکال کر آنے جانے والوں کو جاسوسانہ نظر سے دیکھ رہی تھیں، نظر آئیں اور رشید نے طارق کی طرف متفکر نگاہوں سے دیکھ کر کہا:۔

"کیا یہی ہے آپ کا پریم نگر؟ خدا خیر کرے۔"

"ابھی معلوم ہو جائے گا" طارق نے متانت سے جواب دیتے ہوئے گاڑی قصبہ کی طرف موڑ دی۔ لوگوں نے دور سے ایک فوجی گاڑی قصبے کی طرف آتے دیکھی تو استقبال کے لئے دوڑے۔ انھوں نے چند ڈوگروں کو دور سے تاڑ لیا تھا۔ خوش کیوں نہ ہوتے۔ اب وہ آزاد تھے اور یہ آزاد قوم کے سپاہی جن پر انھیں فخر و ناز تھا، جن کی سنگینوں کی نوکیں نہتوں کے سینے چھلنی کرتی تھیں اور جو بچوں، بوڑھوں عورتوں کو ذبح کر کے اپنی بہادری اور جوانمردی پر نازاں تھے۔ گاڑی رکی اور ہجوم چاروں طرف جمع ہو گیا۔ طارق، خالد، نسیم اور رشید باری باری اُترے۔ بعد میں سعیدہ کو اتارا گیا۔ وہ اس وقت بہ تقاضائے حالات برقع میں نہیں تھی۔ ہجوم نے نقلی ڈوگروں کو دیکھ کر جیکارے لگائے اور یہ چھوٹا سا جلوس محبت رائے کی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ ایک گران ڈیل اور بھیانک سا

دشمن ہجوم کو چیرتا ہوا ان ڈوگروں کے پاس آیا اور چلا کر کہنے لگا:-

"ٹھہر جاؤ" ـــــ اس کے جواب میں یہ لوگ ٹھہر گئے۔ دشمن مذکور نے طارق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"تم کب سے ہندی فوج میں ہو، پاکستان نہیں گئے؟"

"نہیں کیور، میں نہیں جاؤں گا۔"

"تم یہاں کس طرح پہنچے ہو؟ کیا راستے میں کوئی سورما نہیں ملا؟ اور یہ لڑکی کون ہے؟"

"میری بہن ہے۔ تم محبت رائے کے مکان پر آؤ سب کچھ بتا دوں گا" ـــــ اتنا کہہ کر طارق نے پھر آگے بڑھنا شروع کیا۔ کیور نے لوگوں کو بتا دیا کہ یہ لوگ مسلمان ہیں۔ وہ طارق کے ساتھ بہت دفعہ گرد و نواح کے علاقوں میں شکار کھیل چکا تھا۔ اس لئے اچھی طرح جانتا تھا۔ ہجوم میں سے بعض لوگ ادھر ادھر منتشر ہو گئے اور انھوں نے گاؤں میں متعینہ ڈوگروں کی چوکی کو ان مسلمانوں کی آمد کی اطلاع دی۔ چند ڈوگرے دوڑتے ہوئے آئے۔ ابھی محبت رائے کی حویلی کچھ فاصلے پر تھی کہ انھوں نے نو واردوں کو گھیرے میں لے لیا اور ڈوگرہ جمعدار نے طارق سے پوچھا۔

ڈوگرہ جمعدار۔ تم کون ہو؟ یہاں کیوں آئے ہو؟

طارق۔ میں اپنے چچا محبت رائے کے پاس آیا ہوں۔

جمعدار۔ پاکستان نہیں جاؤ گے؟

طارق۔ جانا ہوتا تو ہندوستان کے اس اندرونی ضلع میں کیوں آتا۔

جمعدار۔ یہ وردیاں تم نے کہاں سے لی ہیں؟

طارق - ہمارے چند مہربان افسروں نے ہماری جان بچانے کے لئے دی ہیں۔ جمعدار دنیا میں سب کے سب ظالم نہیں ہوتے۔

جمعدار - یہ درست ہے۔

اتنے میں کپور نے ایک ڈوگرے سپاہی کو کچھ اشارہ کیا اور اس نے اپنی رائفل طارق کی طرف تان لی۔ لیکن جمعدار نے چونک کر کہا۔

جمعدار - (چونک کر)، ٹھہرو۔

اس نے رائفل نیچی کر لی تو جمعدار نے پھر کہنا شروع کیا۔

جمعدار - تم جانتے ہو کہ یہ محبت رائے کے پاس آئے ہیں۔ جو کانگرس کے مقبول رکن ہونے کے علاوہ بڑے امیر بھی ہیں۔ اگر ان کی ہلاکت پر انھیں کوئی اعتراض ہوا تو کون جواب دے گا؟

کپور - میں جواب دوں گا۔

جمعدار - ہم تمہیں نہیں جانتے کہ تم کون ہو۔

ادھر یہ جھگڑا ہو رہا تھا کہ اُدھر سے شور سا اُٹھا "ٹھہرو، ٹھہرو، ٹھہرو" اور چودھری محبت رائے چند دوسرے معززین کے ہمراہ چیختے چلاتے ہوئے آئے۔ انھیں دیکھ کر ہجوم ایک طرف ہٹ گیا۔ محبت رائے نے آتے ہی طارق کو گلے سے لگا لیا۔ سعیدہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ باقی سب سے مصافحہ کیا۔ پھر جمعدار سے مخاطب ہو کر کہا:-

محبت رائے - جمعدار جی یہ میرا بھتیجا ہے اور باقی بھی اپنے عزیز ہیں۔

جمعدار - اگر آپ کے ہیں تو پھر ہمارے بھی متر ہیں۔ آئیے آپ کی حویلی تک چھوڑ آؤں۔

تھوڑی سی دیر میں یہ سب لوگ محبت رائے کی حویلی میں تھے۔ طارق نے لوگوں کو بتایا کہ وہ اگرچہ مسلمان ہے لیکن ہمیشہ ہمیشہ اپنے وطن ہندوستان میں رہنا چاہتا ہے۔ اب یہ اُن کے رحم و کرم پر ہے کہ زندہ چھوڑیں یا مار ڈالیں۔ ہندوؤں اور سکھوں سب نے اُسے یقین دلایا کہ وہ سب اس کی حفاظت کریں گے، خواہ ان کی جان پر ہی کیوں نہ بن آئے۔ ان کا بال بیکا نہ ہونے دیں گے۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کپور علاقہ کے سب انسپکٹر پولیس کو بھڑکا کرے آیا۔ اس نے آتے ہی محبت رائے سے کہا:۔

سب انسپکٹر۔ چودھری جی آپ بزرگ ہیں میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ــــــ

چودھری محبت رائے۔ فرمایئے پنڈت جی کیا بات ہے؟

سب انسپکٹر۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کے مہمان یہاں زندہ اور سلامت رہ سکیں گے؟

محبت رائے۔ ایشور کی مرضی سے۔

سب انسپکٹر۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ آپ کی حویلی میں انھیں کوئی کچھ نہیں کہے گا مگر انھیں تو ہمیشہ کے لیے یہیں رہنا ہے پاکستان جانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ کب تک گھر میں پڑے رہیں گے؟ آخر بازار میں آنا جانا پڑے گا۔

محبت رائے۔ دیکھیئے پنڈت جی میری زندگی میں تو قصبے کا کوئی شخص ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا اور جو کسی نے شرارت کی بھی تو اس کے خاندان کو ختم کر دینا میرے خاندان کا کام ہے۔ باقی رہے آپ، تو اپنی بات کھول کر بیان کیجیے۔

سب انسپکٹر۔ چودھری جی میں ان کا دشمن نہیں بلکہ مجھے بھی ان کی حفاظت کرنا ہے۔ چونکہ مجھے ان کی جان خطرے میں نظر آتی ہے اس لئے انھیں پاکستان بھجوانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ ان کی حفاظت کی ذمہ داری لیں تو میں آپ سے بیس ہزار کی ضمانت طلب کروں گا۔ اگر ان کو کسی نے ہلاک کر دیا تو آپ کو زرِ ضمانت ادا کرنا پڑے گا۔ سوچ لیجئے۔

محبت رائے۔ پنڈت جی چودھری میدان سے بھاگنے والا نہیں۔ بیس ہزار کیا ایک لاکھ کی ضمانت کہیئے تب بھی تیار ہوں۔

اس طویل بحث کے چودھری محبت رائے نے بیس ہزار کی ضمانت دے کر سب انسپکٹر کو رخصت کیا اور طارق سے کہنے لگا:۔

محبت رائے۔ طارق بیٹا تم جانتے ہو کہ اس نے ضمانت کیوں طلب کی ہے۔ اس نے مجھے یہ جتانے کی کوشش کی ہے کہ تمہیں کبھی نہ کبھی قتل کر دیئے جانے کے امکانات ہیں۔ اگر تم مروا دیئے گئے تو مجھے بیس ہزار کی رقم ادا کرنی پڑے گی۔ مطلب یہ کہ میں بیس ہزار کی ادائگی کے خوف سے تمہاری حفاظت کی ذمہ داری چھوڑ دوں۔ مگر ایسا کب ہو سکتا ہے۔ کوئی اپنی اولاد سے بڑھ کر دولت کو عزیز نہیں رکھتا۔ اچھا میں یہ حویلی کے ساتھ والا مکان کھلوائے دیتا ہوں وہیں ڈیرا ڈال دو۔ نوکر چاکر بھی بھیج دونگا۔ ابھی بعض غریب مسلمان اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے ہیں انھیں میں سے دو چار تمہاری چاکری کے لئے آجائیں گے۔ سعیدہ کی خدمت کے لئے ایک مسلمان عورت بھی بھیجے دیتا ہوں۔ باقی ہر قسم کی ضروریات کی طرف سے بالکل بے فکر رہو۔ جس طرح عزت رائے میرا بیٹا ہے ویسے تم ہو۔

جاؤ اب ذرا منہ ہاتھ دھولو کھانا آہی رہا ہے۔

ابھی یہ لوگ کھانا کھا کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ جامو نے آکر بتایا حضور مکان کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔ دو مسلمان ملازم اور ایک ملازمہ بھی حاضر ہے۔ یہ سن کر طارق نے محبت رائے سے کہا:۔

طارق۔ اچھا چچا اب ہم اس مکان میں جاتے ہیں جہاں تمام عمر بسر کرنی ہے۔

محبت رائے۔ مگر دیکھو ابھی دو چار دن پکانے کا تردد نہ کرنا۔ مجھے بھی میزبانی کے فرائض ادا کر لینے دو۔

اس کے بعد طارق نے اپنی وردیوں، اسلحہ اور گاڑی سے متعلق کچھ کہا کہ وہ حفاظت کے ساتھ رکھی جائیں اور ضائع نہ ہوں۔ محبت رائے جیسے صاحب رسوخ اور صاحب اقتدار انسان کے لئے یہ کام دشوار نہیں تھا اور وہ جانتا بھی تھا کہ ایک نہ ایک دن پھر انھیں اس کی ضرورت پڑے گی۔ اس نے طارق کو سکھا پڑھا دیا کہ جو کوئی پوچھے اُسے یقین دلا دو کہ اب ہم پاکستان جانے کا ارادہ نہیں رکھتے' ہندوستان ہی میں جئیں گے اور یہیں مریں گے۔ ویسے دل تو محبت رائے کا بھی یہی چاہتا تھا کہ طارق اُس سے جدا نہ ہو۔ وہ اسے اپنے مرحوم دوست کی نشانی سمجھتا تھا لیکن اس نے اپنے خیال کا اظہار مناسب نہ سمجھا۔

طارق اور اس کے ساتھی جب دوسرے مکان میں گئے تو اسے نہایت صاف ستھرا اور وسیع پایا۔ صحن میں ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی تھا۔ چودھری چچا نے ایک بھینس بھی بھیج دی تھی اور آٹا چاول گھی سبھی کچھ۔ سعیدہ تو ملازمہ کے ساتھ

زنانے میں چلی گئی اور خالد وغیرہ مردانے کا جائزہ لینے لگے۔ اتنے میں عزت رائے چند دوستوں کو ساتھ لئے آپہنچا اور گپ شپ ہونے۔ عزت رائے آزاد خیال سا تھا یعنی مذہب کے معاملے میں کٹر ہندو نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کے سبھی مذاہب ایک ہی قسم کے ہیں صرف مختلف ممالک میں پرورش پانے کی وجہ سے تھوڑا تھوڑا اختلاف ہے۔ وہ کہتا مذاہب ہیں کیا مختلف رہنماؤں کے بتائے ہوئے عبادت کے مختلف طریقے۔ عبادت کرنی چاہیئے خواہ کسی طور طریقہ سے ہو۔ اس میں لڑنے مرنے کی کونسی بات ہے۔ پھر یہ کہ انسان سبھی ایک ہی نسل سے تو ہیں، تعصب اور نفرت کیسی۔ رنگ و روپ اور زبان کا فرق آب و ہوا اور تبدیلیٔ وطن سے پیدا ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ عزت رائے نے فسادات سے متعلق اظہارِ افسوس کرتے ہوئے اپنی حکومت کی مذمت کی، اور ہر طرح کی امداد کا وعدہ کیا۔ کافی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ جب دیر زیادہ ہو گی تو اس نے مزید تشفی کرتے ہوئے اجازت چاہی۔ طارق نے گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر رخصت کیا۔ طارق اور اس کے ساتھی تھکے ماندے تو تھے ہی، اس لئے چاہتے بھی یہی تھے کہ عزت رائے اب گھر جائے تو ذرا آرام کریں۔ جب وہ چلا گیا تو طارق نے نسیم سے کہا کہ اگرچہ ہم طرح محفوظ و مامون مقام پر ہیں پھر بھی یہ مقام دشمنوں کا ہے اس لئے تم مکان کے اندرونی حصہ میں جاؤ۔ سعیدہ کی حفاظت تمہارے ذمے ہے۔ یہ ایک یک منزلہ مکان ہے دیوار بھی زیادہ اونچی نہیں۔ ممکن ہے کوئی بدنہاد شرارت کے لئے عقب سے کود آئے۔ طارق کے اس حکم پر خالد کچھ مسکرایا اور نسیم تعمیلِ حکم کے لئے زنانے میں چلا گیا اور اندر جاتے ہی سعیدہ سے کہنے لگا:-

"سعیدہ میں تمہارے پاس سوؤں گا۔"

"نہیں نہیں، آپ باہر تشریف لے جائیں۔" اس نے گھبرا کر جواب دیا۔

"مجھے تمہاری حفاظت کا حکم ملا ہے۔" نسیم نے مسکرا کر کہا۔

"بھائی مجھے شرم محسوس ہوتی ہے۔ اتنے دنوں کے بعد ایک چار دیواری آرام کے لئے ملی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ ذرا بے تکلفی سے اٹھوں بیٹھوں۔ عرصہ سے مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ پھر رہی ہوں۔" سعیدہ نے جواب دیا۔

"مکان کی چار دیواری تو ملی ہے لیکن جانتی نہیں ہو کہ مکان کس جگہ واقع ہے۔" نسیم نے کہا۔

"پریم نگر میں۔ طارق بھیا کے مربی محبت رائے کی حویلی کے پہلو میں۔ واہ جانتی کیوں نہیں۔" سعیدہ نے جواب دیا۔

"ہزار اطمینان کے باوجود بھی احتیاطی تدابیر پر عمل کرنا ضروری ہے۔"

"لیکن میرے پاس سردار سو رہے گی۔" سعیدہ نے کہا۔

"نہیں بی بی، میں رات کو یہاں نہیں سو سکتی۔ میرے بچے راہ تک رہے ہونگے۔" سردار نے جواب دیا۔

"تو اب تباؤ۔" نسیم نے ایک طرف بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا تمہاری مرضی، لیکن مجھے تمام رات نیند نہیں آئے گی۔" سعیدہ بولی۔

"وہ کیوں؟" نسیم نے پوچھا۔

"نسیم بھیا عجب انسان ہیں آپ بھی، آخر شرم حیا بھی کوئی چیز ہے۔" اس نے کہا۔

"یہ میدانِ جنگ ہے۔ یہاں عورتوں کا تنِ تنہا رہنا مناسب نہیں۔ تمہیں شرم و

حیا مارتی ہے اور ہمیں دشمنوں سے تمہاری حفاظت کا خوف ہے۔"

"آخر آپ باہر طارق بھیا کے پاس کیوں نہیں سوتے؟"

یہ فقرہ سن کر نسیم قدرے جھینپ گیا۔ پھر سنبھل کر کہنے لگا:۔

"تو میں باہر ہی چلا جاتا ہوں۔ اگر پچھواڑے سے کوئی اغوا کرنے آگیا تو مدد کے لیے نہ پکارنا۔" یہ کہہ کر نسیم جانے لگا تو سعیدہ گھبرا کر بولی:۔

"نہیں نہیں، ٹھہرو۔"

"بس ہو گئی ترکی تمام۔" نسیم نے کہا۔

"اچھا میں اعتراض نہیں کرتی۔ آپ جہاں چاہیں آرام کریں۔ مجھے ویسے بھی آپ کی ——"

"کیا؟" نسیم نے پوچھا۔

"بس یہی کہ آپ کی عزت مدنظر ہے۔ آپ ہی کی گولی نے میری جان بچائی تھی۔" سعیدہ نے کہا۔

"یوں کہو کہ میری گولی نے تمہاری بہن کی جان لی تھی۔ مجھے اس پر تمام عمر افسوس رہے گا۔"

"لیکن آپ کی نیت تو اسے بچانے کی تھی۔ اگر آپ کی گولی سے ایک دشمن ہلاک نہ ہوتا تو دوسرا مجھے چھوڑ کر نہ جاتا۔" سعیدہ نے یہ کہتے ہوئے آہ بھری۔

"دیکھو خدا کے لئے رونا نہیں۔" نسیم نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں اب کیا رونا ہے۔ ایک بہن کیا ہزاروں بھائیوں بہنوں کی لاشیں راستے میں دیکھ چکی ہوں۔ اب تو جگر پتھر اور دل فولاد ہو گیا ہے۔"

"اگر دل و جگر میں یہ سختی پیدا ہو چکی ہے تو مجھے آپ کی حفاظت کے لئے پریشان ہونا مناسب نہیں اور باہر چلے جانا چاہیئے۔" نسیم نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں، خدا کے لئے ایسا نہ کرو نہیں تو میں ابھی رو دوں گی۔" سعیدہ نے دامن کھینچتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو بھئی نہیں جاتے۔ جاؤ اب ذرا سو جاؤ۔" نسیم نے کہا اور قریب کے ایک پلنگ پر دراز ہو گیا۔

اچھا، جیسے آپ کا حکم۔" سعیدہ کہتے ہوئے اُٹھی۔

"مہربانی کر کے باہر صحن میں نہ سونا۔ اگرچہ گرمیوں کا موسم ہے پھر بھی اپنی جان کی حفاظت کے لئے اندر ہی سونا چاہیئے۔ ہم لوگ غیر مقام پر ہیں۔" نسیم نے تاکید کی۔

"اطمینان رکھو میں ساتھ والے کمرے میں پڑ رہوں گی۔" سعیدہ نے جاتے ہوئے کہا اور چلی گئی۔

سعیدہ یوں تو دوسرے کمرے میں چلی گئی لیکن نہ جانے کیوں اس کا دل نسیم کے کمرے میں گھوم رہا تھا۔ وہ نسیم کی طرف کھنچی چلی جا رہی تھی۔ اس کے خیال کو ذہن سے نکالنے کی بہت کوشش کرتی لیکن بے فائدہ۔ وہ پہلے ہی دن سے اس کی شجاعت اور خلوص کو دیکھ کر گرویدہ سی تھی مگر اظہارِ خیال کا کبھی موقع ہی نہیں ملا تھا۔ آج یہ پہلا دن تھا کہ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن جرأت نہ تھی۔ وہ پلنگ پر لیٹ کر دل ہی دل میں کہنے لگی۔

"نسیم تم نے میری جان بچائی ہے اور ہزاروں دوسرے مسلمانوں کی خاطر دشمن

سے لڑائی لڑی ہے۔ میں تمہاری شجاعت کی معترف ہوں نہیں جانتی کہ شکریہ کس طرح ادا کروں۔ تمہارے لئے میرے دل میں محبت اور جذبات کا طوفان مچلتا ہے۔ میں اپنی عقیدت کا اظہار کرنا چاہتی ہوں مگر زبان دل کا ساتھ نہیں دیتی۔"

اُدھر نسیم بھی نہ جانے کن خیالات میں کھویا ہوا سا تھا۔ چند دنوں کی بے آرامی اور تکان کے باوجود نیند نہیں آرہی تھی۔ رات نصف گذر چکی تھی۔ گاؤں کے گلی کوچوں میں کتے رو رہے تھے۔ تاریک سناٹے میں ان کی چیخیں خوف اور اُداسی طاری کر رہی تھیں۔ اچانک سعیدہ کی آواز آئی:۔

"کیا سو گئے ہو تم؟"

"نہیں تو ابھی کہاں سویا ہوں۔ تم بھی تو ابھی جاگ رہی ہو۔ آخر کیوں؟"

"ڈر محسوس ہوتا ہے۔" سعیدہ نے جواب دیا۔

"پتھر کا جگر اور فولاد کا دل رکھتے ہوئے بھی؟" نسیم نے پوچھا

"گرمی بھی تو بہت ہے۔" سعیدہ نے کہا۔

"ٹھنڈے دل سے کام لو۔" نسیم نے جواب دیا۔

"ڈرتی ہوں۔"

"تو کیا اُدھر آجاؤں؟" نسیم نے کہا۔

"نہیں۔"

"نہیں، میں آرہا ہوں۔"

"خدا کے لئے ـــــ میں بھاگ جاؤں گی۔"

"کہاں؟"

"کوٹھے پر۔"

"وہاں بھتنے ناچ رہے ہیں اور نہ جانے کتنی بندوقیں تاک میں بیٹھی ہیں۔"

"میں جان پر کھیل جاؤں گی۔"

"وہ کیوں؟"

"نہیں معلوم، تم خود ہی سوچو۔"

"میں تو بہت سوچتا ہوں لیکن کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔"

"ایسے موقع پر سمجھ مشکل سے کام دیتی ہے۔"

"پتھر کا جگر اور فولاد کا دل ہونا چاہیئے۔" نسیم نے طنزاً کہا۔

"اس پر بھی تو خوف محسوس ہوتا ہے۔"

"سو جاؤ۔ اب تو رات نصف سے زیادہ بیت چکی ہے۔"

"نصیب سو جائیں تو انسان کا جاگتے رہنا ہی بہتر ہے۔" سعیدہ نے کہا۔

"یہ وقت شاعری کا نہیں۔"

"شاعری نہیں، حقیقت بیان کرتی ہوں۔"

"حقیقت تو تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔" نسیم نے کہا۔

"میں نے تو کھول کر بیان کر دی ہے۔ تم نہ سمجھو تو میرا کیا قصور؟"

"سمجھ رہا ہوں۔" نسیم نے جواب دیا۔

"کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔" سعیدہ نے کہا۔

"اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو یوں ہی سہی۔"

اب کی سعیدہ نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش پڑی رہی۔ نسیم نے دو تین بار

بلایا بھی "سوگئی ہو بہن؟ اتنی جلدی ہار گئیں۔" جواب میں سعیدہ پڑی مسکراتی رہی حتیٰ کہ سچ مچ نیند نے آلیا اور دونوں کمروں میں خاموشی چھا گئی۔

بھید

(۱)

دوسرے دن صبح ہوتے ہی سردار گھر سے آگئی۔ یہاں یہ تمام لوگ بھی بیدار ہو چکے تھے لیکن نسیم ہنوز بستر پر پڑا تھا۔ اسے رات سے قدرے بخار ہو گیا تھا۔ طارق نے محبت رائے کے یہاں سے اسپرو منگا کر کھلا دی اور عزت رائے کو قصبے کے ہسپتال سے دوا لینے بھیج دیا۔ اگرچہ نوکر موجود تھے لیکن حالات کا تقاضا یہی تھا کہ کوئی ذمہ دار شخص دوا لائے تاکہ بغیر کسی کھٹکے کے مریض کو کھلائی جاسکے۔ تقریباً دس بجے کے قریب تھانے دار آیا اور اس نے طارق سے کہا کہ ایک قافلہ پاکستان جارہا ہے۔ آپ بھی چاہیں تو جا سکتے ہیں۔ اس نے جواب دیا پنڈت جی سو بار بتا چکا ہوں کہ میں اپنے وطن ہندوستان کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ آپ

خواہ مخواہ مجھے دق نہ کریں۔ اس جواب سے وہ شرمسار ہو کر چلا گیا۔ کوئی دوپہر کے قریب اطلاع ملی کہ جو بدنصیب مسلمان اس قافلے میں گئے تھے سب کے سب ہلاک ہو گئے ہیں صرف تین زخمی نہ جانے کس طرح محبت رائے کی حویلی میں پہنچ گئے جنھوں نے یہ تمام واقعات سنائے۔ طارق نے اُن کی تیمارداری تو کی لیکن وہ بھی نہ بچ سکے۔

قصبے کے جو بھی لوگ طارق اور اس کے ساتھیوں سے ملنے آتے وہ اس بات کی بہت کوشش کرتے کہ کسی نہ کسی طرح یہ لوگ شدھ ہو جائیں۔ وہ کہتے جب تم کو پاکستان جانا ہی نہیں تو پھر مذہب کیوں نہیں بدل لیتے۔ اس سلسلے میں طارق جواب دیتا پہلے علمی طور طریقہ سے ہمیں قائل کرو۔ ہم ہندو مت کے عقائد بھی تو سمجھ لیں لہذا دوستانہ طور پر خوب بحث ہوتی۔ محبت رائے اور اس کا بیٹا عزت خاموش رہتے۔ انھیں اس معاملے سے دلچسپی نہیں تھی۔ بحث میں حصہ لینے والے قصبے کے دوسرے لوگ ہی ہوتے اور طارق کی طرف سے رشید اور خالد۔ نسیم جب سے بیمار ہی پڑا تھا۔ طارق نے اسے مکمل طور پر آرام کرنے کی ہدایت کر رکھی تھی۔

ایک دن جب سردار دوپہر کا کھانا لے کر گھر چلی گئی اور گھڑی نے دو بجائے تو سعیدہ دوا کی پیالی لے کر نسیم کے پاس آئی اور کہنے لگی :۔

"دوا حاضر ہے' سرکار۔"

نسیم سن کر مسکرا دیا۔

"تمہیں بلا وجہ تکلیف ہوتی ہے۔ میں مجبور ہوں۔" نسیم نے کہا۔

"کس بات کے لئے؟" سعیدہ نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، کچھ نہیں۔" نسیم نے کہا۔

"نہیں، کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔" سعیدہ نے پوچھا۔

"نہیں، سچ مچ کچھ نہیں۔" نسیم نے جواب دیا۔

"بس دو منٹ میں بدل گئے، ابھی کچھ کہنے کا ارادہ کیا اور ابھی ——"

"سعیدہ، تم غلط فہمی میں ہو۔"

"عورت ہمیشہ غلط فہمی ہی میں مرتی ہے۔"

"میں مجبور ہوں ذرا سمجھو۔"

"مجھے تمہاری مجبوری سے کیا۔ میں تو اپنی مجبوریوں سے سروکار رکھتی ہوں۔ تم نے مجھے دشمن سے بچایا تھا۔ نہ بچایا ہوتا۔ اب جبکہ میں دنیا میں تن تنہا ہوں مجھے دھتکارتے ہو۔ لیکن میں جو ارادہ کر چکی ہوں اُسے بدل نہیں سکتی۔"

"تم حد سے تجاوز کر رہی ہو۔ اس مقام پر نہ پہنچو جہاں سے لوٹنا مشکل ہو جائے۔ خدا کی قسم اگر میں مجبور نہ ہوتا تو ——"

"اگر میں مجبور نہ ہوتی تو اس دنیا سے کب کی رخصت ہو چکی ہوتی۔ انسان مرنے کے لئے دشمن کا محتاج نہیں۔"

"تو کیا خودکشی کر لیتیں؟"

"ایک بے سہارا عورت کے لئے اس کے سوا اور چارۂ کار ہی کیا ہے۔ میں تو اس کے لئے جیتی ہوں کہ جس نے میری جان بچائی ہے۔ یہ امانت اسی کی ہے کہ جس نے اس کی حفاظت کی تھی۔"

"تو کیا یہ درست ہے؟"

"بالکل۔"

"اچھا تو میں اس امانت کو جس کی میں نے حفاظت کی تھی اپنے حقوقِ ملکیت کے پیش نظر بھائی خالد کے سپرد کرتا ہوں۔"

"مجھے تم سے ایسی اُمید ہرگز نہ تھی" سعیدہ نے تعجب کے انداز میں کہا۔

"تو کیا وہ خوبصورت نہیں، بہادر نہیں؟" نسیم نے پوچھا۔

"وہ سب کچھ ہے لیکن میں اپنا دل نہیں بدل سکتی۔ یہ جان تمہیں نے بچائی تھی اس لئے چاہتی تھی کہ یہ تمہارے ہی سپرد ہو۔ اب جبکہ تم نے انکار کر دیا ہے یہ خدا کے سپرد ہوگی۔"

نسیم نے دوائی کی پیالی سعیدہ کی طرف بڑھائی تو وہ رو رہی تھی۔ سعیدہ نے پیالی الماری میں رکھ دی اور خود دوسرے کمرے میں جاکر پلنگ پر لیٹ گئی اور دل ہی دل میں کہنے لگی۔ خدایا اگر تجھ کو آج مجھے مایوس ہی کرنا تھا تو میری جان کیوں بچائی۔ ماں باپ شہید ہوئے۔ ایک بہن تھی وہ بھی جدا ہوئی۔ اب جس کے لئے جی رہی ہوں وہ مجھے دوسروں کا پتہ بتاتا ہے۔ لیکن یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ میرے اللہ مجھے ذلیل نہ کر۔ اس زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ میں اسے اس لئے نہیں چاہتی کہ وہ امیر ہے۔ وہ تو میری ہی طرح تباہ حال اور دین کی راہ میں لٹا پٹا سا ہے اور میں اس کی جانبازی پر فریفتہ ہوں۔ اس نے تیرے نام پر جہاد کیا ہے، جان پر کھیل کر تیرے بندوں کی حفاظت کی ہے۔ وہ بہادر ہے۔ اسی لئے میں اسے چاہتی ہوں۔ لیکن وہ مجھے ٹھکراتا ہے۔ خدایا میری مدد کر۔ ان خیالات کے زیر اثر وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ نسیم دروازہ کی آڑ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

سہ پہر کے بعد جب خادمہ آئی تو سعیدہ نے کہا کہ آج وہ خود ہی کھانا پکا لے۔ اس کی طبیعت درست نہیں۔ اُدھر نسیم نے بھی خالد اور طارق کو بلا کر کچھ کانا پھوسی کی اور وہ مسکراتے ہوئے باہر چلے گئے۔ آج کی شام نہایت اداس گذری۔ رات کے نو بجے کے قریب سعیدہ دوا کی پیالی لے کر تو آئی لیکن نسیم کے پاس میز پر رکھ کر چلی گئی۔ نسیم نے ذرا بلند لہجے میں کہا:۔

"میں آج باہر مردانے ہی میں سوؤں گا۔"

جواب میں سعیدہ خاموش رہی اور دوسری طرف چلی گئی اور دل میں کہنے لگی میں چاہتی بھی یہی ہوں۔ اِدھر نسیم آہستہ آہستہ اُٹھا اور باہر مردانے میں چلا گیا۔ سردار اپنے گھر جا چکی تھی۔ تقریباً ساڑھے نو بج چکے تھے۔ ہر طرف اُداسی چھائی ہوئی تھی مگر سعیدہ کی آنکھوں میں نیند نہ تھی بلکہ ایک قسم کا تحیر اور رنج تھا۔ رات کی تاریکی میں ایک شخص دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا۔ سعیدہ آہٹ سنتے ہی کھڑی ہو گئی۔ آنے والے کے ہاتھ میں برہنہ تلوار اور منہ پر نقاب تھا۔ سعیدہ نے چونک کر پوچھا:۔

"تم کون ہو؟"

"یہ تلوار بتائے گی کہ میں کون ہوں۔"

اس نے تلوار ہوا میں لہرائی جسے دیکھتے ہی سعیدہ کے اوسان خطا ہو گئے۔ بھاگنے کے لئے لپکی لیکن جوان نے کلائی سے پکڑتے ہوئے کہا:۔

"خبردار جو آواز نکالی نہیں تو اسی تلوار سے سر اڑا دوں گا۔"

اس کے ساتھ ہی وہ اُسے گھسیٹتا اور کھینچتا ہوا باہر صحن کی طرف بڑھنے لگا۔

سعیدہ کا حال نہ پوچھ۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ آواز نکالنے کی کوشش کرتی مگر حلق خشک ہو جاتا۔ دشمن اُسے گھسیٹتا ہوا برآمدے میں لے آیا اور اُس نے دست درازی شروع کر دی۔ سعیدہ چلّائی :۔

"خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو۔ خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو۔"

"ہرگز نہیں۔ آج ہی تو موقع ملا ہے۔" دشمن نے رعب دار لہجہ میں لیکن ذرا آہستہ کہا۔ اتنے میں آواز آئی :۔

"سعیدہ گھبراؤ نہیں۔ میں آگیا ہوں خالد۔"

اس کے ساتھ ہی کسی نے دشمن کے سر پر اس زور سے ڈنڈا مارا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ سعیدہ جھٹ سے خالد کے پاؤں پر گر پڑی اور خالد بھیّا خالد بھیا کہہ کر رونے لگی۔ خالد نے اُسے اُٹھایا اور کہا حوصلہ کرو ابھی تو دشمن کو ٹھکانے لگانا ہے۔ گھر والے سب سو رہے ہیں کسی کو جگانا مناسب نہیں۔ ہم دشمن کے گاؤں میں ہیں کسی کو خبر ہو گی تو بس قیامت آجائے گی۔ تم اندر چلی جاؤ میں اکیلا ہی نبٹ لوں گا۔

"میں اندر نہیں جاؤں گی۔ مجھے آپ کے بغیر ڈر محسوس ہو گا۔" سعیدہ نے کانپتے ہوئے جواب دیا۔

"اندر چلی جاؤ، ابھی زندہ ہے۔"

"ابھی زندہ ہے؟"

"ہاں ہاں غور سے دیکھو۔ سانس جاری ہے۔" خالد نے کہا۔

پھیکی سی چاندنی میں جو بادلوں سے چھن چھن کر نکل رہی تھی سعیدہ نے غور

کیا تو دشمن میں حرکت کے آثار نظر آنے لگے۔ اس نے ڈر کر خالد سے لپٹتے ہوئے کہا:۔

"خالد بھیا خدا کے لیے مجھے بچائیے۔"

"ڈرو نہیں۔ وہ اُٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ذرا سی دیر میں موت کی نیند سلادوں گا۔ اُٹھنے تو دو۔"

"خالد میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں مجھے بچائیے۔ میں آپ کا احسان تمام عمر نہیں بھولوں گی۔" سعیدہ خالد سے لپٹ کر کہنے لگی۔ اتنے میں وہ دشمن تن کر کھڑا ہو گیا اور طنزاً کہنے لگا:۔

"بلکہ یوں کہو کہ تمام عمر تمہاری ہو کر رہوں گی۔"

"اچھا یونہی سہی۔" سعیدہ نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا۔

یہ سنتے ہی خالد اور نسیم بے اختیار ہنس دیے اور خالد نے گویا نسیم کو پہچانتے ہوئے کہا:۔

خالد۔ اچھا یہ آپ ہیں سردار نسیم سنگھ صاحب۔ بھئی تم نے اپنے لمبے لمبے بالوں سے خوب فائدہ اُٹھایا ہے۔

سعیدہ۔ (غصے سے) بس رہنے دو جی، یہ سب کچھ تم نے سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق کیا ہے مجھے ڈرانے کے لیے، ایک ڈرامہ کھیلا ہے۔ بھلا اس سے فائدہ؟

نسیم۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ محترمہ نے بھائی خالد کی ہو کر رہنے کا وعدہ کر لیا۔ دوسرا یہ کہ اب میرا چھٹکارا ہو گیا۔

سعیدہ۔ (بگڑ کر) بس جی زیادہ زبان نہ کھولو۔ کوئی بے غیرت سے بے غیرت مرد بھی اپنی توہین اس بُرے انداز میں نہیں کر سکتا۔ تم اگر مجھے ٹھکرانے پر تُلے

ہی بیٹھے ہو تو میں اس زندگی سے موت بہتر سمجھتی ہوں۔

نسیم۔ ہوش کرو سعیدہ، تم نادانستہ طور پر خالد کی موجودگی میں اُن سے نفرت کا اظہار کر رہی ہو۔ وہ اپنے دل میں کیا سمجھتے ہوں گے۔ اپنے چند منٹ پہلے کے الفاظ نہ بھولو کہ تم نے انہی کی ہو کر رہنے کا وعدہ کیا تھا۔

سعیدہ۔ وہ تو محض خوف و ہراس کی وجہ سے۔

نسیم۔ وہ محبت ہی کیا جو خوف اور ہراس کی وجہ سے کافور ہو جائے۔ جب دل میں بھولے سے بھی دوسرے کا خیال پیدا ہو اُسے چیر کر سینے سے نکال دینا بہتر ہے۔

سعیدہ۔ (غصے میں) لو پھر نکال ہی دو۔ یہ سینہ حاضر ہے۔ اگر تم میرے زخموں پر اسی طرح نمک پاشی چاہتے ہو تو مجھے بھی گریز نہیں۔

نسیم۔ میں جانتا ہوں کہ یہ پل میں بدل جانے والا دل اتنا بہادر نہیں کہ اسے ہم اپنے ستم کا حریف بنائیں۔

سعیدہ۔ نسیم خدارا مجھے نہ ستاؤ۔ (رونے لگی)

اُسے روتا دیکھ کر خالد سے نہ رہا گیا اور اس نے یہ ڈرامہ ختم کرنے کے ارادے سے کہا:۔

خالد۔ بس بی نسیمہ صاحبہ اپنی بڑی بہن کو زیادہ دق نہ کرو۔ حد سے زیادہ مذاق بھی اچھا نہیں ہوتا۔ سعیدہ، تم نسیمہ کی گستاخیاں معاف کر دو۔ یہ بچپن ہی سے بے حد شریر ہے۔

سعیدہ۔ (حیرانی سے) واہ اب آپ لگے مذاق کرنے۔

خالد۔ نہیں مذاق نہیں بلکہ جو کچھ میں بتا رہا ہوں وہ ایک حقیقت ہے۔ نسیم لڑکا نہیں لڑکی ہے اور میری چھوٹی بہن۔ والد کی شہادت کے بعد نقلِ مکانی اور فرار کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا تھا کہ اسے مردانہ بھیس میں زندگی بسر کرنا چاہیئے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ اس کی آواز میں کس قدر لوچ ہے۔ اگرچہ ایک عرصہ تک اُس نے آواز اور چال بدلنے کی مشق جاری رکھی پھر بھی خاطر خواہ تبدیلی نہ ہوئی۔ غیر تو کیا پہچانیں گے مگر ہمیں اب بھی اطمینان نہیں۔ ابتدا میں بال بالکل مردانہ فیشن کے بنائے گئے تھے۔ اب پھر پٹوں کی صورت اختیار کر رہے ہیں اور تم سے گریز کی وجہ بھی یہی ہے ورنہ ——"

نسیمہ۔ (خالد کو ٹوکتے ہوئے) ہش بھائی اب آگے نہ بڑھو۔

سعیدہ حیران و ششدر نسیمہ کی طرف دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد سعیدہ بولی :-

سعیدہ۔ آفریں ہے بھئی، لڑکی ہو تو ایسی ہو، بہادر، نڈر، دشمن کو لوہے کے چنے چبوانے والی۔ اے کاش پاکستان کی ساری لڑکیاں ایسی ہی جاں باز ہوں، ورنہ میرے جیسی تو قوم اور ملک پر ایک بوجھ ہیں۔ بھئی نسیمہ ہم نے تمہیں مان لیا۔

نسیمہ۔ بھائی خالد کو بھی مان لو نا۔

خالد۔ بس چپ رہو۔

اتنا کہہ کر خالد ہنستا ہوا باہر چلا گیا اور سعیدہ نسیمہ کو گھسیٹتی ہوئی اندر لے گئی۔

نسیمہ۔ بھئی سعیدہ آپا آج تو ہم اکٹھے ہی سوئیں گے۔

سعیدہ۔ ہرگز نہیں۔

نسیمہ۔ وہ کیوں؟

سعیدہ۔ وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا۔

نسیمہ۔ واہ بہن کیسی مردانہ طبیعت رکھتی ہو۔ عورتوں سے مل بیٹھنے کا شوق ہی نہیں۔

جب تک یہ بندی مرد تھی آپ کو بھی میری چاہ تھی اور اب ——

سعیدہ۔ اری تم تو بال کی کھال اتارتی ہوں اب چھوڑو بھی میرا پیچھا۔

نسیمہ۔ چند منٹ پہلے تو ہمارے گریز کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اب خود گریزاں ہو، یہ خوب بھئی ہم تو جس کے ہو جاتے ہیں تمام عمر اس کا پیچھا نہیں چھوڑا کرتے۔

سعیدہ۔ اچھا میاں نسیم اللہ صاحب اب سونے بھی دو گے یا نہیں۔ رات تو کافی جا چکی ہے۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں اپنے پہلو میں جگہ دینے کو تیار ہوں۔

نسیمہ۔ زہے قسمت۔

ان الفاظ کے ساتھ نسیمہ سعیدہ کے پہلو میں لیٹ گئی۔ دونوں بہنیں دیر تک گذشتہ واقعات سے متعلق گفتگو کرتی رہیں۔ نسیمہ نے اُسے بتایا کہ وہ طارق کی چچا زاد بہن اور منسوبہ ہے۔ فسادات سے بہت عرصہ پہلے وہ اپنی زمینوں پر جاکر بندوق پستول کے استعمال کی مشق کیا کرتی تھی۔ اب اس کا نشانہ بہت اچھا ہے۔ نسیمہ نے اُسے یہ بھی بتایا کہ وہ پردہ کی پابند نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوسری پردہ دار عورتوں کی طرح ساتھیوں کی پریشانی اور گھبراہٹ کا باعث نہیں بنی، بلکہ ہر معاملے میں ان کا ہاتھ بٹاتی رہی۔ اس نے کہا کہ برقع اسلامی پردہ نہیں اور نہ ہی کسی اسلامی ملک میں ایسا پردہ رائج ہے۔ پردہ کے مذہبی احکام کو وہ تسلیم کرتی ہے لیکن

زمانے کے حالات بھی مدنظر رکھنے پڑتے ہیں۔ پردہ کے لیۓ ایک چادر کافی ہے جس طرح کہ ہمارے دیہات کی عورتیں چادر سے اپنا جسم ڈھانپ کر پردہ کے احکام کی تعمیل کرتی ہیں۔ لیکن یہ برقع والا پردہ تو عورت کو اپاہج بنا دیتا ہے۔ فرض کرو ایک برقع میں لپٹی ہوئی عورت پر ایک بدمعاش حملہ کر دے تو وہ کیا خاک اپنی حفاظت کریگی۔ وہ تو پہلے ہی ایک بنڈل میں ملفوف ہوگی، اس کے ہاتھ پاؤں آزادی سے حرکت نہیں کر سکیں گے اور اس کا گلا گھوٹنے اور چیخ و پکار کو دبانے کے لیۓ تو برقع ممد و معاون ثابت ہوگا۔ وہ بے چاری خاک مدافعت کریگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری عورتیں کثرت سے ہلاک ہوئی ہیں۔ ہزاروں وہ تھیں جو پردہ داری کی وجہ سے کبھی گھروں سے باہر ہی نہ نکلی تھیں اور جو کبھی نکلی بھی تھیں انھیں آزادانہ چلنے پھرنے کی عادت نہیں تھی۔ جھجھک نے اُن کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں۔ بعض شریف زادیوں نے دشمن کی دراز دستی کے خلاف اس لیۓ آواز نہیں نکالی کہ کوئی سن لے گا تو کیا کہے گا۔ ہزاروں ایسی تھیں جنھیں دوڑنے بھاگنے کا سلیقہ ہی نہیں تھا بعض بوکھلا کر راستہ بھول گئیں۔ یہاں تو ایسی عورتوں کی ضرورت تھی جو لکڑی، چمٹا، اینٹ پتھر غرضیکہ جو کچھ بھی ہاتھ آتا لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑتیں اور مارتے ہوئے ماری جاتیں۔ جناب پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانے میں بھی عورتوں نے میدانِ جنگ میں خدمات سرانجام دیں، زخمیوں کی مرہم پٹی کی، مجاہدین کو پانی پلایا اور وقتِ ضرورت خیموں کی چوبیں لے کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑیں۔ ایک موجودہ قسم کی برقع پوش عورت جو ایک آباد چوراہے سے بہ آسانی نہیں گذر سکتی وہ جہاد کے وقت خاک خدمت کرے گی بلکہ وہ تو عین لڑائی کے وقت پریشانیوں کا موجب بن جائے گی۔ مرد

اس کی حفاظت کریں گے یا دشمن سے لڑیں گے۔ عورتوں کو چاہیئے کہ حالات کے ساتھ ساتھ اپنی طبیعت کو بدلیں۔

سعیدہ دیر تک نسیمہ کی تقریر سنتی رہی۔ وہ اس لڑکی کی بہادری پہلے ہی دیکھ چکی تھی، اب اس کی قابلیت کی بھی تعریف کرنی پڑی۔ رات زیادہ جا چکی تھی آخر نیند نے بھی مجبور کیا اور یہ دونوں بہنیں سو گئیں۔

(۲)

صبح سویرے جب سردار کام کے لئے آئی تو اس نے سعیدہ کے ساتھ "نسیم" کو ایک ہی چارپائی پر دیکھا تو واپس جانے لگی مگر سعیدہ نے تاڑ کر کہا:۔

سعیدہ ۔ گھبرا کیوں گئی ہو۔ یہ تو میری بہن ہے۔ آج رات ہی یہاں آئی ہے۔

سردار بھی سیانی تھی۔ پہلے غور کیا۔ پھر معاملہ سمجھ گئی اور کہنے لگی:۔

سردار ۔ بی بی ولایت میں سنا کرتے تھے کہ بعض مرد عورت بن گئے ہیں لیکن اب تو یہاں اپنی آنکھوں دیکھ لیا۔

نسیمہ ۔ بھئی کیا کریں زمانہ انقلاب کا ہے۔ ہر چیز بدل رہی ہے۔ اگر ہم بدل گئے تو کیا ہوا۔

سعیدہ ۔ مگر یہ تو اصلیت کی طرف بدلی ہیں۔

سردار ۔ بی بی سنا تھا کہ جیسی صحبت ہو انسان ویسا ہی بن جاتا ہے۔ آپ کی صحبت نے نسیم کو نسیمہ بنا دیا۔ اب مجھے تو اپنا ڈر ہے کہ میں کچھ اور نہ بن جاؤں۔

نسیمہ - تم رات کو تھوڑی یہاں رہتی ہو۔

سردار - اچھا، یہ تبدیلیاں رات ہی کو ہوتی ہیں۔

سعیدہ - ہاں رات کے بعد ہی سورج طلوع ہوتا ہے۔

نسیمہ - دن کے بعد غروب ہوتا نہیں دیکھا؟"

سعیدہ - کیا کوئی اور شعبدہ دکھانا چاہتی ہو؟"

نسیمہ - وقت پر دکھا ہی دیں گے۔ لو ذرا یہ انگوٹھی بھائی خالد کی طرف سے پہن لو۔

سعیدہ - تم ہی پہنا دو میرے مسٹر نسیم۔

سعیدہ نے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے ہاتھ بڑھایا اور نسیمہ نے اپنے ہاتھ سے ایک قیمتی انگوٹھی اُتار کر اُسے پہنا دی اور ساتھ ہی ماتھا چوم لیا۔ سردار خوشی سے چیخی "مبارک مبارک"۔ اتنے میں طارق بھی اندر چلا آیا اور پوچھنے لگا:-

طارق - مبارک، کیسی مبارک - کچھ ہمیں بھی بتاؤ؟"

نسیمہ - بہن سعیدہ اور بھائی خالد ———

طارق - (سمجھ کر) بس ٹھیک ہے۔ کسی نے کہا ہے 'بے کار مباش کچھ کیا کر' اور تم اسی اُصول کو مدنظر رکھ کر کچھ کر رہی ہو۔ مگر اتنا یاد رہے کہ تمہارا اپنا راز یعنی مسٹر نسیم والا، اس چار دیواری سے باہر نہ جانے پائے۔ بتاؤ ہم کتنے مرد یہاں آئے تھے۔

نسیمہ - چار، طارق، خالد، رشید اور نسیم۔

طارق - ٹھیک ہے۔ جب تک ہم پاکستان نہ پہنچ جائیں نسیمہ نسیم ہی رہے۔ سردار کو بھی سمجھا دو کہیں باہر کسی سے بات نہ کرے۔

سردار۔ کیا میں مسلمان نہیں ہوں جو آپ مجھے شک کی نظر سے دیکھتے ہیں؟
طارق۔ تم تو ہماری بہن ہو۔ یہ الفاظ احتیاطاً کہنے پڑتے ہیں، شک کی وجہ سے نہیں۔
سردار۔ میں تو خود امید رکھ رہی ہوں کہ کسی نہ کسی دن آپ کے ساتھ پاکستان جاؤں گی۔ میں نے تو خود یہاں ایسی مصیبتیں دیکھی ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ یہ زمین ہم مسلمانوں کے لئے تنگ ہو چکی ہے۔
طارق۔ ذرا ہمیں بھی تو اپنی آپ بیتی سناؤ۔
سردار۔ چھوڑو بھیا اس قصے کو، سن کر کیا لو گے؟ خواہ مخواہ طبیعت پریشان ہو گی۔ مجبوروں اور ناتوانوں کی داستانِ غم سننے کے قابل نہیں۔
نسیمہ۔ نہیں بھئی ہم تو ضرور سنیں گے۔ ویسے بھی تمہاری زبان ماماؤں کی سی نہیں۔ تم کسی اچھے گھرانے کی عورت ہو۔
سردار۔ اچھی تو خدا کی ذات ہے۔
طارق۔ بے شک۔ جو یہ سمجھتا ہے وہ خود بھی اچھا ہے۔ اچھا تو ہماری درخواست قبول کرو اور اپنی آپ بیتی سنا دو۔
سردار۔ بھئی آپ کے سامنے مجھے شرم محسوس ہوتی ہے۔
طارق۔ لو جناب ہم باہر ہی چلے جاتے ہیں۔ کسی کو مجبور کرنا مناسب نہیں۔
نسیمہ۔ ہاں ہاں آپ جائیے۔ بے چاری جھجکتی ہے ——
طارق مسکرا کر چلا گیا۔
سعیدہ۔ بہن سردار اب تو سناؤ۔

سردار - آج رات میں اپنے بچوں کو لے کر یہیں آ جاؤں گی۔ دن بھر تو کام کاج کرنا ہے۔ رات کو شام کا کھانا کھا لینے کے بعد آپ کو بتاؤں گی کہ میری آنکھوں نے کیا دیکھا اور مجھ پر کیا کچھ بیتی۔

سعیدہ - ہاں یہ مناسب ہے۔ آؤ اب پیٹ پوجا کا بندوبست کریں۔

یہ فیصلہ ہو جانے کے بعد سعیدہ، نسیمہ اور سردار مختلف کاموں میں مصروف ہو گئیں۔

(۳)

دن بھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر سردار اپنے گھر گئی اور دو بچوں کو لیکر جلد ہی لوٹ آئی۔ یہ بچے دو اور تین برس کے درمیان تھے۔ کھانا کھا چکنے کے بعد نسیمہ نے داستان کے لئے درخواست کی۔ لیکن اس نے جواب دیا کہ اس کے لئے عشا کے بعد کا وقت زیادہ مناسب ہے۔ نمازِ عشا ان تینوں نے باجماعت ادا کی اور اپنی اپنی چارپائیوں پر دراز ہو کر اس المناک اور دردانگیز داستان میں محو ہو گئیں۔ سردار نے اپنے بچوں کو تھپکتے ہوئے کہا۔

"شاید آپ کو گمان بھی نہ ہو کہ یہ ناچیز بھی کوئی چھ مہینے پہلے ایک کھاتے پیتے رئیس کی بیوی تھی اور خود میری خدمت کے لئے تین چار ملازم تھے۔ میاں کی بات تو چھوڑیئے اُن کے نوکروں، خوشامدیوں اور حقہ برداروں کی تعداد گنتی سے باہر تھی۔ ہمارا گاؤں پریم نگر سے کوئی چالیس میل کے فاصلے پر آباد تھا اور اب بھی آباد ہے، اگرچہ ہم برباد ہو گئے ہیں۔ لوگ اسے "سلوک" کہتے ہیں۔ ویسے بھی

یہاں کے باشندے سلوک اور محبت میں اپنی نظیر آپ تھے۔ سلوک میں صرف سکھ اور مسلمان آباد تھے۔ ہندو نام کو بھی نہیں تھا۔ میرا شوہر گاؤں کا رئیس اول تھا۔ یوں تو سکھوں میں بھی اچھے اچھے زمیندار تھے لیکن میرے شوہر کے رتبے کو نہیں پہنچتے تھے۔ ان لوگوں کا آپس میں اتنا سلوک تھا کہ اس کی مثال ملنی دشوار ہے۔ گذشتہ پچیس تیس برس میں ملک میں ہزاروں فرقہ وار فساد ہوئے، انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑایا، اتحاد کی لٹیا کئی بار نفاق کے طوفان میں ڈوبی مگر سلوک کے باشندے ان ہنگاموں سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئے۔ ویسے بھی یہ لوگ ایک ہی نسل سے تھے۔ موہن سنگھ اور سوہن سنگھ دو سگے بھائی تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے شاہی خاندان سے ملتا تھا۔ مغلوں کی صحبت اور مسلمان فقراء کے فیض نے ایک بھائی موہن سنگھ کو مسلمان بنا دیا۔ مگر سوہن بدستور سکھ ہی رہا۔ اس مذہبی تغیر سے ان کی محبت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ وہ اسی طرح شیر و شکر رہے۔ سوہن کہا کرتا تھا خدا کا نام لینے سے غرض ہے خواہ کسی طرح لیا جائے۔ اس کا خیال تھا کہ مسلمان اور سکھ میں کوئی خاص فرق نہیں۔ سکھ مسلمان ہی طرح جفاکش اور جنگجو ہے۔ دونوں لڑنا مرنا جانتے ہیں۔ مسلمان کی طرح سکھ بھی توحید پرست ہے۔ ڈاڑھی اور لباس میں ایک سکھ ایک مغل سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ وہ فرنگیوں کی ان کہانیوں کو جھوٹ کا طومار سمجھتا تھا جو انھوں نے اورنگ زیب کے مظالم کے متعلق مشہور کر رکھی تھیں۔ وہ کہا کرتا کہ اگر مغل بادشاہ اس قدر متعصب ہوتے تو آج بھارت میں ہندوؤں کی اکثریت نہ ہوتی۔ مختصر یہ کہ موہن کے مشرف باسلام ہو جانے کے بعد بھی، دونوں بھائی ایک جان دو قالب

ہی رہے اور سلوک ومحبت میں کوئی فرق نہ آیا۔ گاؤں کی آبادی دو مختلف مذاہب میں تقسیم ہو کر رہ گئی۔ ایک بھائی کی اولاد مسلمان اور دوسرے کی سکھ۔

اب جبکہ یہ فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی تو گرد و نواح کے سکھوں نے کرم سنگھ کو جو سوہن سنگھ والی پارٹی کا موجودہ سردار تھا کہلا بھیجا کہ وہ ہم مسلمانوں کا قلع قمع کر دے۔ اس نے جواب دیا کہ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ اپنے ہی بھائیوں کے خون سے ہولی کھیلے، وہ آخر اپنے ہی تو ہیں۔ مگر انھوں نے اصرار کیا کہ ان مسلمانوں کا مٹا دینا ہی مناسب ہے۔ وہ ایک غیر مذہب کے پابند ہیں نیز اپنے لئے ایک الگ حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر کرم سنگھ اپنے عقیدے پر ڈٹا رہا۔ اس نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ میرے خاوند شیر خاں کو بلا بھیجا اور اس سے خلوت میں کہنے لگا:۔

کرم سنگھ۔ بھائی، حالات بہت بگڑ گئے ہیں اور ہندوؤں کے فریب میں آکر سکھوں نے بھی مسلمانوں کے خلاف جنگ شروع کر دی ہے۔ گرد و نواح کے لوگوں نے جنھیں آپ خوب جانتے ہیں مجھے کہلا بھیجا ہے کہ ـــــ

شیر خاں۔ (بات کاٹ کر) کہ مسلمانوں کو گاؤں سے نکال دیا جائے اور ان کا مال و زر لوٹ لیا جائے۔ لیکن تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ جب تک شیر خاں زندہ و سلامت ہے گاؤں کا ایک بھی مسلمان ہجرت کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

کرم سنگھ۔ آپ درست فرماتے ہیں اور یہ بھی سن لیں کہ جب تک کرم سنگھ کی آل و اولاد زندہ ہے گاؤں کے ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کی بھی حفاظت کی جائے گی۔

اس مختصر کانفرنس کے بعد یہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اُس رات

میرے شوہر کو نیند نہ آئی۔ اس کے ساتھ ہی گھر کے تمام مرد نوکر چاکر اور دوسرے مسلمان بھی جاگتے رہے۔ ہولناک خیال دلوں میں جاگزیں ہو گئے۔ گرد و نواح سے خوفناک نعرے سنائی دینے لگے۔ مگر ہمارا گاؤں اب بھی خاموش تھا۔ سکھ اپنی جگہ جاگ رہے تھے اور مسلمان اپنی جگہ۔ انھیں ہماری طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ البتہ وہ ڈرتے تھے کہ مبادا گرد و نواح کے دشمن جتھے گاؤں کے مسلمانوں پر آ پڑیں اور ہمارے ہمسایوں کا خاتمہ کر دیں۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا اور وہ رات امن و امان سے گذر گئی۔ دوسرے دن کرم سنگھ کو کہیں سے یہ پیغام آیا کہ تم پنتھ کی اطاعت نہیں کر رہے ہو اور اپنے رویے کی اصلاح کرو ورنہ ہم تمہیں بھی مسلمان سمجھنے کے لئے مجبور ہوں گے۔ یہ پیغام لے کر چند سکھ سردار ایک جیپ میں آئے تھے۔ اُن کے ہمراہ دو فوجی افسر بھی تھے۔ مگر کرم سنگھ اُصول کا پکا تھا اس نے وہی ٹکا سا جواب دیا۔ اب تو ہمیں پورا یقین ہو گیا کہ کوئی نہ کوئی گُل کھِل کر رہے گا۔ شیر خاں نے کرم سنگھ کو بلا کر سمجھایا۔

شیر خاں۔ بھائی تم ہماری وجہ سے اپنے آپ کو خطرے میں نہ ڈالو اور اُن سے کہلا بھیجو کہ راستہ کھُلا ہے، صاف چلے آئیں، میں خود ہی نپٹ لوں گا۔ تم خواہ مخواہ ہماری وجہ سے لوگوں کی دشمنی خرید رہے ہو۔

کرم سنگھ آج، اگر موہن اور سوہن ہوتے تو وہ کیا کرتے۔ کیا بھائی بھائی کو پِٹتے دیکھ سکتا ہے اور وہ بھی فسادیوں کے ہاتھوں۔ اگر ہم گورو گوبند سنگھ کے چیلے ہیں تو ہمیں گورو نانک کا اُپدیش بھی نہیں بھولنا چاہیئے جو کُل دنیا کے لئے صلح و آشتی کا پیغام لے کر آئے تھے اور اسلام اور اسلامی بندگوں کے مداح تھے۔

شیر خاں۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن عوام ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ اُن کی آنکھوں

پر تعصب کی پٹی بندھی ہے۔ فتنہ و فساد کے شیطان اُنھیں اُکسا رہے ہیں، بغض و عناد کے بھوت اُن کے رہنما ہیں۔ وہ اس شور و شغب میں تمہاری آواز نہیں سنیں گے۔

شیر خاں کے جواب میں کرم سنگھ کا بیٹا شام سنگھ جو وہیں موجود تھا کہنے لگا۔

شام سنگھ۔ تایا، آپ ہمیں شرمندہ نہ کریں۔ آپ کی حفاظت ہم پر مذہباً اور اخلاقاً فرض ہے۔ جب تک ہم گاؤں میں زندہ ہیں ہم دشمن کو اِدھر کا رُخ نہیں کرنے دیں گے۔ ہم جئیں گے تو ایک ساتھ اور مریں گے تو ایک ساتھ۔

یہ گفتگو گاؤں کے بالکل قریب ہمارے کنوئیں پر ہو رہی تھی۔ ابھی شام سنگھ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور کرم سنگھ کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ شام نے پلٹ کر دیکھا تو مہندر بندوق لئے کھیتوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ شام نے باپ کی لاش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شام۔ تایا، یہ آپ کے لئے پہلی قربانی ہے۔

اس فقرے کے ساتھ ہی اس کے جذبات قابو سے باہر ہو گئے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ گاؤں کے سکھ حلقے میں ایک دم شور اُٹھا اور ست سری اکال کے نعروں نے ایک قیامت برپا کر دی۔ مہندر نے لوگوں میں مشہور کر دیا کہ شیر خاں نے افضل خاں کا بدلہ لے لیا ہے۔ جس طرح سیواجی نے ملاقات کے بہانے افضل خاں کو مار ڈالا تھا اسی طرح شیر خاں نے کرم سنگھ کو قتل کر دیا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ لوگ جو کل تک دوستی کا دم بھرتے تھے بندوقیں، بھالے اور تلواریں لے کر ہمارے کنوئیں کی طرف بڑھنے لگے اور کافی دور ہی سے گولیوں کی بوچھار شروع کر دی۔ شام باپ کی لاش کو تو بھول گیا اور

اب اُسے تایا کی حفاظت کی فکر ہوئی۔ حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے یہ دونوں کنویں کی منڈیر کو مورچہ بنا کر لیٹ گئے۔ اتفاق سے کرم سنگھ کی بندوق قریب ہی تھی جسے شام نے فوراً اُٹھا لیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ گردونواح کا کوئی جتھہ گاؤں میں گھس آیا ہے۔ اُس نے ایک دو تین چار فائر کیے۔ بدنصیبی دیکھیے کہ اسی کے دو چھوٹے بھائی ہلاک ہو گئے۔ لہلہاتی فصل اور فاصلے کی وجہ سے اپنے پرائے کی تمیز مشکل تھی۔ اُدھر گاؤں میں الگ ہنگامۂ کارزار برپا تھا۔ ہر کوٹھا ایک قلعہ اور ہر دیوار ایک مورچہ بن چکی تھی۔ کنویں کی طرف بڑھتی ہوئی پارٹی بتدریج قریب تر آ گئی۔ یہ لوگ تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ جب انھیں احساس ہوا کہ ہمارا مدِ مقابل شیر خاں نہیں بلکہ شام سنگھ ہے تو ایک نے چلّا کر کہا:۔

ایک۔ شام جی، یہ آپ ہیں؟

شام۔ اور تمہارا باپ ہے۔

اس جواب سے تمام ہنگامے پر اوس پڑ گئی۔ شام اور شیر خاں بھی اوٹ سے نکل آئے اور وہ لوگ بھی سامنے آ گئے۔ ایک سکھ نوجوان نے پستول کی نالی میرے خاوند کی چھاتی پر رکھ دی۔ یہ دیکھ کر شام نے گرج کر کہا:۔

شام۔ ابے ہوش کر پرتاپ!

پرتاپ۔ اپنے چچا کے قاتل کو چھوڑ دوں؟

شام۔ معلوم ہوتا ہے تمہارے بارہ بج چکے ہیں۔ ارے کمبخت پتاجی میری موجودگی میں میرے سامنے ہلاک ہوئے ہیں۔ تایا شیر خاں اور ہم دونوں یہاں باتیں کر رہے تھے کہ ایک گولی ادھر سے آئی اور پتاجی کے سینے میں پیوست ہو گئی۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو مہندر بندوق لئے کھیتوں میں چھپ رہا تھا۔ تایا تو بالکل بےگناہ ہیں۔ اُن کے پاس تو چاقو بھی نہیں۔

پرتاپ۔ اب سمجھا۔ مہندر ہی نے ہمیں جاکر بتایا تھا کہ تایا شیر خاں نے کرم سنگھ کو قتل کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تایا جی پر گولی چلائی جو اُن کی جان لیوا ہوئی۔

شام۔ سنا نہیں 'چاہ کن را چاہ درپیش'؟

پرتاپ۔ (روکر) گور بخش اور کرتار دونوں ہلاک ہوگئے ہیں۔

شام۔ میری گولیوں سے۔ تایا آپ کی خاطر قربانی پر قربانی۔ اُف اب تو میں گھر میں اکیلا رہ گیا ہوں۔

اس حادثے کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ سب چپ چاپ گھروں کو لوٹ گئے۔ گاؤں میں تفصیلات پہلے ہی پہنچ چکی تھیں۔ اس لئے اب یہاں بھی جنگ ختم تھی۔ ہر شخص حیران تھا کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا ہوگیا۔ سکھ اپنی جگہ پشیمان تھے کہ خواہ مخواہ بھڑک اٹھے۔ مہندر کی تلاش جاری تھی مگر وہ فرار ہو چکا تھا۔ اس کی جان خطرہ میں تھی اور تھا بھی وہ گردن زدنی، جس کی حماقت سے سلوک کے خرمنِ امن پر فساد کی بجلی گر پڑی۔ شام سنگھ نے قسم کھائی کہ جب تک مہندر سے خون کا بدلہ نہ لوں گا پلنگ پر نہیں سوؤں گا اور بیوی کے پاس نہیں جاؤں گا' وغیرہ

اس روز شام سے کچھ پہلے جبکہ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا چند فوجی ٹرک گاؤں میں داخل ہوتے نظر آئے۔ مسلمانوں کا ماتھا ٹھنکا اور وہ گھروں میں محصور ہو بیٹھے۔ اور سکھ جو خود پریشانی میں مبتلا تھے بادلِ ناخواستہ اُن کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ فوجی ڈوگروں نے گاؤں کے نوجوانوں اور ذی اثر سکھوں کو ایک جگہ جمع کرلیا

اور ان کی نقل و حرکت پر کڑی نگرانی مقرر کر دی۔ اس کام سے فارغ ہو کر مسلم علاقے کو گھیرے میں لے لیا گیا۔ یہاں پہلے ہی سے معلوم تھا کہ اب کیا ہونا ہے۔ ہر مسلمان اپنے حساب کے مطابق مورچے پر ڈٹ گیا۔ مٹی کی کچی دیواروں میں اسٹن گن کی گولیاں الجھنے لگیں۔ کوئی گھنٹہ سوا گھنٹہ یہ آتش باری جاری رہی۔ پھر یہ لوگ متعدد لاشیں چھوڑ کر خود بخود رخصت ہو گئے۔ مسلمان بھی کافی شہید ہو چکے تھے۔ اس وقت موقع غنیمت سمجھ کر ہماری حویلی میں ایک میٹنگ بلائی گئی جس میں میرے بھتیجے رحیم خاں نے اس طرح شروعات کی:۔

رحیم۔ (شیر خاں سے) تایا، اب آپ کا شام سنگھ اور پرتاپ کہاں گئے؟

شیر خاں۔ بیٹا، مجھے اطلاع مل چکی ہے کہ ڈوگرہ افسروں نے گاؤں کے ذی اثر سکھوں کو اپنے قابو میں رکھا ہوا ہے تاکہ مسلمانوں کی مدد نہ کر سکیں، ورنہ وہ ضرور ہمارے لئے کچھ نہ کچھ کرتے۔

رحیم۔ ڈوگرے محاصرہ اُٹھا چکے ہیں۔ اب ہمیں گاؤں چھوڑ کر بھاگ جانا چاہیئے۔

شیر خاں۔ بھاگنا آسان نہیں۔ بظاہر ڈوگرے جا چکے ہیں لیکن وہ گاؤں کے گرد و نواح میں ضرور کہیں چھپے ہوں گے۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ہماری حویلی کے زنانخانے میں جہاں میں اور چند عورتیں مغموم و متفکر بیٹھی تھیں عقبی دیوار کی مٹی گرنے لگی اور رفتہ رفتہ ایک نقب سا بن گیا۔ ہمیں حیرانی ضرور تھی کہ خدایا یہ کیا قصہ ہے مگر اطمینان تھا کہ اس طرف سے دشمن نہیں آ سکتا۔ پچھواڑے شام سنگھ کا گھر تھا جس کی محبت میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ نقب مکمل ہو چکا تو شام کی والدہ ہرنام بی بی اور اس کی بہو کرتار و ہمارے مکان میں

گھس آئیں۔ میری چودہ پندرہ سالہ لڑکی انھیں دیکھ کر چلّانے لگی اور دو نوعمر بچے ڈر کر رونے لگے۔ میں نے اشارے سے انھیں چپ رہنے کو کہا۔ ہرنام بی بی نے آتے ہی انھیں پیار کیا اور گلے سے لگایا اور ہمیں سرگوشی میں ایک مہیب خطرے کی اطلاع دی۔ بعد ازاں کچھ ضروری مشورہ دے کر اسی نقب کی راہ سے واپس چلی گئی۔ کوئی لمحہ بھر کے بعد مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ آتش بار مینگوں کی مدد سے مکان مسمار کردیئے گئے، عورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ سینکڑوں لوگ پناہ کے لئے کھیتوں اور باغوں کی طرف بھاگے۔ کئی شیر خوار بچے اپنے والدین کے پاؤں تلے روندے گئے، بوڑھے اور اندھے کنوؤں میں ڈوب ڈوب کر مر گئے۔ شیر خاں اور رحیم نے خوب مقابلہ کیا۔ جب رحیم باہر میدان میں گر پڑا تو میرے خاوند نے گھر کی راہ لی اور میرے دالان میں آیا۔ اس وقت کرتا رو اور ہرنام بی بی ہمیں اپنے مکان میں پناہ لینے کے لئے کہہ رہی تھیں۔ شیر خاں نے آتے ہی 'رشیدہ رشیدہ' پکارا۔ یہی ہماری نوجوان لڑکی تھی۔ وہ غریب سہمی ہوئی سامنے آئی تو اس نے بندوق کی نالی اس کے سینے پر رکھ کر فوراً گھوڑا دبا دیا اور چلّایا "اب میں آرام سے مرسکوں گا۔ آرام سے مرسکوں گا۔ اب مجھے اپنی آبرو کا خطرہ نہیں۔" وہ دیوانہ سا ہو رہا تھا، گویا ایک رشیدہ ہی اس کی تھی اور ہم کچھ نہیں تھے۔ اس کے دو بچے سامنے دیوار کے ساتھ چمٹ کر کھڑے تھے، میں بھی قریب ہی تھی لیکن اس کی نگاہ میں رشیدہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ بات بھی ٹھیک ہے ایک نوجوان لڑکی ہی ماں باپ کی آبرو ہوتی ہے۔ وہ اُسے ہلاک کرنے میں حق بجانب تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ مسلمان کی بازی ہر چکی ہے بس اسی لئے اس نے اپنی نوجوان لڑکی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور خود

جوش وغضب کے عالم میں باہر چلا گیا۔ اتنے میں شام سنگھ اور پرتاپ نقب کے راستے ہماری طرف آئے۔ انھوں نے زور زور سے پکارا "تایا"، "تایا"۔ میں نے کہا ابھی باہر نکلا ہے۔ شام سنگھ کہنے لگا غضب ہو گیا، اب ہم انھیں کس طرح بچا سکتے ہیں۔ باہر تو خون کا سیلاب گولیوں کی بارش، آگ کا طوفان، فسادیوں کا زور اور ٹینکوں کا شور ہے۔ کچھ توقف کے بعد وہ از خود چلاتے لگا "نہیں میں انھیں ضرور بچاؤں گا خواہ مجھے اپنی جان پر کھیلنا پڑے"۔ ہرنام بی بی اور کرتار و مبہوت سی اس کا منہ تک رہی تھیں۔ ان کے رنگ فق تھے۔ منہ پر ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں مگر میرے پاسِ خاطر سے اسے منع کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ آخر وہ چلاتا ہوا باہر میدان میں چلا ہی گیا۔ جوں ہی شام گھر سے نکلا اس کی نظر تڑپتے ہوئے شیر خاں پر جا پڑی۔ وہ اُس وقت پانی پانی پکار رہا تھا۔ شام دوڑ کر گھر میں آیا اور ایک برتن میں پانی لے کر پھر چلا گیا۔ وہ پانی پلانے کے لئے شیر خاں پر جھکا ہی تھا کہ ایک گولی آئی اور اُس کے پہلو کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا ہمارے پاس آیا اور گر کر بے ہوش ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد اُسے جیسے آرام سا آگیا اور وہ ہوش وحواس میں باتیں کرنے لگا۔ اس نے اشارے سے مجھے قریب بلا کر کہا تائی ہماری ایک اور قربانی۔ تم گواہ رہنا میں مسلمان مرتا ہوں۔ میں اُس فرقے میں مرنا پسند نہیں کرتا جس کے تعصب کی یہ انتہا ہے کہ ہمارا سارا خاندان محض اس لئے ختم کر دیا گیا کہ وہ مظلوم کی حمایت کرتا تھا۔ میں اپنی ماں، بیوی اور سارے کو وصیت کرتا ہوں کہ میری پیروی کریں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی روح عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی۔ ہرنام بی بی رونے لگی اور کرتار و یہ کہہ کر کہ پرتاپ بھیا اب کیا ہوگا بے ہوش ہو گئی۔ پرتاپ بہن کو اُٹھا کر نقب کی

راہ سے دوسری طرف چلا گیا اور ہم بھی سب کے سب ادھر ہی آگئے اور نقب نظاہر بند کر دیا گیا۔

تمام رات میں، کرتارو اور ہرنام بی بی روتی رہیں۔ دو میرے اور دو کرتارو کے بچے خاموشی سے سسکیاں لے رہے تھے۔ ہرنام بی بی کو خیال تھا کہ گاؤں کے غیر مسلم اب اُن کے بھی دشمن ہیں۔ اسی لئے وہ اب اپنے سکھ ہمسایوں سے بھی گریزاں تھی۔ کوئی بلاتا تو روکھا پھیکا جواب دے کر خاموش ہو جاتی۔ صبح ہوئی تو ہر طرف سناٹا تھا۔ میں نے کوٹھے پر سے نظر دوڑا کر دیکھا تو دور دور تک لاشوں کے انبار تھے۔ ٹینک اور ٹرک واپس جا رہے تھے۔ اُن کی وجہ سے دُھول اڑ اڑ کر فضا کو مکدر کر رہی تھی۔ اُداس فضا، اڑتی ہوئی دھول، لاشوں پر اڑتے ہوئے چیلوں کے غول، کہیں کہیں کتوں کی جھڑپیں، جی چاہتا تھا کہ پاگل ہو جاؤں لیکن یہ اپنے بس کی بات نہ تھی۔ گاؤں کے جو ہمدرد قسم کے لوگ تھے وہ نکتہ چینیوں کے خوف سے دم بخود تھے۔ انھیں شام سنگھ اور اس کے باپ کا انجام خوب یاد تھا۔ جب یہ تسلّی ہو گئی کہ گاؤں سے ڈوگروں کا لشکر جا چکا ہے تو پرتاپ نے چند دوستوں کی مدد سے شیر خاں کی لاش جسے نصف سے زیادہ گدھ نوچ چکے تھے دفن کر دی۔ شام کو باقاعدہ جلا دیا گیا۔ میں نے کہا بھی کہ وہ مسلمان ہو چکا ہے اس لئے دفن کرنا چاہیئے۔ لیکن پرتاپ نے جواب دیا "تائی وقت کا تقاضا یہی ہے کہ ابھی یہ راز فاش نہ کیا جائے۔ دل سے تو ہم بھی مسلمان ہیں۔" میں یہ سن کر خاموش ہو گئی۔ وہ کہتا بھی درست تھا۔ انسان چھوٹی غلطی سے بڑی سے بڑی مصیبت مول لے لیتا ہے۔ میری رشیدہ کو اسی کوٹھری میں دبا دیا گیا جہاں وہ شہید ہوئی تھی۔

ان حادثات کے ظہور میں آچکنے کے بعد گاؤں مسلمانوں سے خالی تھا۔ یہ لوگ یا تو بھاگ گئے تھے یا سب کے سب ہلاک ہو چکے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ مرنے والوں کی تعداد بھاگنے والوں کی تعداد کی بہ نسبت زیادہ تھی۔ دو ایک روز بعد چند مظلوم جو قریبی کنوؤں میں لٹکے ہوئے تھے کسی نہ کسی طرح بچکر جلے ہوئے گھروں میں واپس چلے آئے۔ گاؤں کی سکھ آبادی نے ان کی واپسی پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ ان لوگوں میں ہمارے دو ملازم بھی تھے جو بظاہر سکھ بن کر رہنے لگے۔ کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد جب ذرا سکون ہو گیا تو ان بچے کھچے مسلمانوں کو پاکستان جانے کی سوجھی۔ گاؤں کے غیر مسلموں نے بھی یہی سوچا کہ جس طرح بھی ہو سکے انھیں پاکستان بھجوا دینا چاہیئے۔ یہ لوگ یہاں اطمینان سے کبھی نہیں رہ سکیں گے۔ لہٰذا تھوڑے ہی دنوں کے بعد چند ڈوگرہ سپاہیوں کی حفاظت میں یہ چھوٹا سا قافلہ جس میں کوئی سو سوا سو کے قریب مہاجر تھے گاؤں سے رخصت ہونے لگا۔ روانگی سے قبل پرتاپ میرے پاس آیا اور کہنے لگا تائی اب ہمیں بھی یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیئے۔ میں نے کہا کہ تم خواہ مخواہ ملک و املاک چھوڑ کر جا رہے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ سچائی سے بڑھ کر ہمارے نزدیک اور کسی چیز کی قدر و قیمت نہیں۔ ہم سچائی کے لیے عزیز ترین جانیں دے چکے ہیں۔ ملک و املاک کی کیا حقیقت ہے۔ ہم جائیں گے اور ضرور جائیں گے۔ لیکن سوچنا یہ ہے کہ کس طرح ؟ میں تو یہ کہہ کر ساتھ ہو لوں گا کہ ازراہِ ہمدردی قافلے کو چند میل تک چھوڑنے جا رہا ہوں مگر بے بے (ہر نام بی بی) اور کرتارو کا کیا کیا جائے اور پھر بچے بھی تو ہمراہ ہیں۔ پھر خود ہی سوچ کر کہنے لگا کہ میں ان دو عورتوں کو تمہارے دو ملازموں کی بیویاں ظاہر کر کے سوار کرا دوں گا۔ البتہ بچوں کو چھپانا مشکل ہے۔ پھر کچھ دیر سوچکر

بولا' اچھا روشن سے پوچھوں گا شاید وہ میری مدد کر سکے' ہے تو میرا راز دار ہی۔ اس کے بعد وہ گیا اور تھوڑی سی دیر میں مطمئن ہو کر واپس چلا آیا۔ قافلہ بیل گاڑیوں' گھوڑوں اور گدھوں پر رخصت ہوا۔ گاؤں سے نکل کر ابھی چوتھے میل پر پہنچے تھے کہ روشن آپہنچا اور پرتاپ سے جو ڈوگرہ جمعدار کے ساتھ ساتھ باتیں کرتا چلا جا رہا تھا پکار کر کہنے لگا پرتاپ' مسلمانوں کے یہ دو بچے رہ گئے ہیں لیتے جاؤ۔ پرتاپ گیا اور بچے لے کر کرتارو کے حوالے کر دیے۔ ایک بچے نے اچانک پرتاپ کو بلایا "ماماجی" مگر پرتاپ نے توجہ نہ کی۔ اگرچہ کرتارو نے بہت کوشش کی کہ بچے پرتاپ کی طرف متوجہ نہ ہوں لیکن بے سود۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد ایک بچے نے پھر آواز دی "ماماجی" اب کی ڈوگرہ جمعدار کے دل میں پرتاپ کے متعلق شکوک سے پیدا ہوئے اور اس نے طنزاً کہا:۔

جمعدار۔ سردارجی معلوم ہوتا ہے کہ تم یا تو مسلمان ہو چکے ہو یا مسلمانوں سے ملے ہوئے ہو۔

پرتاپ۔ نہیں جمعدار بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ کہو کہ نیتھ کے حکم سے قافلے کے ساتھ ساتھ ہوں۔

ڈوگرہ۔ تو پھر یہ بچہ آپ کو پکارتا کیوں ہے؟

اتنے میں دوسرا بچہ بھی چلّایا "ماماجی"۔ اب تو ڈوگرے کا وہم یقین میں بدل گیا اور اس نے قافلے کو ٹھہرانے کے لئے سیٹی بجائی۔ قافلہ ٹھہر گیا اور ایک طویل بحث چھڑ گئی۔ پرتاپ کے انکار اور ڈوگرے کے اصرار نے کچھ ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ پرتاپ بھڑک اٹھا اور تنگ آکر کہنے لگا "جوان اگر تمہیں یقین نہیں آتا تو لاؤ مجھے

بندوق دو میں ابھی ان مسلمان بچوں کو موت کی گود میں سلا کر دکھاتا ہوں۔ پھر تو اعتبار کرو گے ؟" اس بات سے ڈوگرہ خوش ہوا اور امتحان کے لئے بندوق اسکے حوالے کر دی۔ پرتاب نے حرکت کی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک گولی ڈوگرہ جمعدار کے دل سے پار کر دی۔ پھر اچانک پلٹ کر دوسرے اور تیسرے پر فائر کئے۔ آخر ایک ڈوگرے کی گولی نے اُسے بھی ختم کر دیا۔ اب کیا تھا خوف وہراس کا مارا ہوا نہتا قافلہ اور ہر طرف بندوقوں کی آتش باری۔ اسی جھگڑے میں میرے دو بچے بھی شہید ہو گئے۔ مسلمان ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔ کرتا رو نے بڑی بہادری سے ایک فوجی کی بندوق چھین لی مگر افسوس چلانا نہیں جانتی تھی۔ آخر ایک بدمعاش نے اسے بھی موت کی نیند سلا دیا اور اس کی چھاتیاں کاٹ کر پھینک دیں۔ یہ دیکھ کر ہر نام بی بی نے جلدی سے اپنے چھکڑے کا گھوڑا ایک نامعلوم مقام کی طرف موڑ دیا۔ میرے دونوں ملازم جو کوچوانی کر رہے تھے بھاگ گئے تھے۔ اب ہماری تقدیر کی باگ ڈور ہرنام بی بی کے قبضے میں تھی۔ شام کے بچے لڑائی کے خوف سے میرے بچوں کی لاشوں کی اوٹ میں لیٹ گئے۔ ڈوگروں کی توجہ کھیتوں میں پناہ لینے والے مسلمانوں کی طرف مبذول رہی اور ہم اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر فرار ہو گئے۔ چھکڑا میدانوں، کھیتوں اور کچی سڑکوں پر ہچکولے کھاتا ہوا نہیں معلوم کہاں سے کہاں آپہنچا حتیٰ کہ شام ہو گئی گھوڑا اس دریا کے کنارے، جو یہاں سے تھوڑی دور اٹھکیلیاں کرتا ہوا بہے جا رہا ہے، آٹھہرا اور گر کر ہلاک ہو گیا۔ ہرنام بی بی بھی بُری طرح زخمی تھی۔ میں حیران ہوں کہ اس معمر عورت نے اتنی دیر کس طرح گھوڑے کو قابو میں رکھا۔ سورج کے غروب ہوتے ہی اس کی زندگی کا آفتاب بھی ڈوب گیا۔ رات کے اندھیرے میں میں نے

اس کی اور اپنے بچوں کی لاشیں دریا میں پھینک دیں تاکہ درندے خراب نہ کریں۔ ابھی اس کام سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ چودھری محبت رائے کا اُدھر سے گذر ہوا۔ انھوں نے مجھے دیکھ کر حال پوچھا تو میں نے رو رو کر آپ بیتی سنادی مگر مصلحتاً اُن بچوں کو اپنے بچے ظاہر کیا اور کیا کرتی مجھے ڈر تھا کہ کہیں انھیں مجھ سے چھین کر نہ لے جائیں۔ میرے لئے ان کی جدائی موت کے برابر ہے۔ داستان سنی تو چودھری محبت رائے نے مجھے تسلی دی اور اپنی پناہ میں لے آئے۔ اب میں اِس آس پر جی رہی ہوں کہ کبھی تو پاکستان کی سرزمین دیکھوں گی۔

اس کے بعد سردار رونے لگی اور محفل پر ایک المناک اُداسی چھا گئی۔ آخر نسیمہ نے مہرِ سکوت توڑتے ہوئے کہا :۔

نسیمہ۔ بہن سردار ابھی کل سے کھانا وغیرہ نہ پکانا۔ ہم خود ہی یہ دھندا کرلیں گے۔

سعیدہ۔ اور ہماری گزشتہ گستاخیاں معاف کردینا۔

سردار۔ مجھے شرمندہ نہ کرو جب قسمت میں لکھا ہی یہی ہے تو ـــــ

نسیمہ۔ (بات کاٹ کر) اب ہم نے اس لکھے کو مٹا دیا ہے۔

سعیدہ۔ بس خاموش رہو یہ کسی کے بس کی بات نہیں۔

نسیمہ۔ واہ کیوں نہیں۔ حضرت آدم یعنی خلیفۃ الارض کی پوتی ہوں۔ کیا ہمیں اتنا بھی اختیار نہیں۔ اور آپا کیا تم یہ بھول گئیں کہ انسان جب تک خود کوشش نہ کرے خدا بھی مدد نہیں کرتا۔ محض ایک آرزو دل میں بسا لینے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔ جہاں تک عمل کا تعلق ہے پیغمبروں کو بھی اپنے کام کی تکمیل کے لئے جد و جہد کرنا پڑی ہے۔ خدا کے محبوبؐ نے اسلام پھیلانے کے لئے جنگیں لڑی ہیں۔ اگر آپ

اور آپ کے صحابی خدائی احکام کے تحت میدان میں دشمن کے سامنے صف آرا نہ ہوتے تو معاملہ دگرگوں ہو جاتا۔ مجھے نام یاد نہیں مگر واقعہ یاد ہے کہ خلفاءِ بغداد میں سے کسی خلیفہ پر ہلاکو خاں نے حملہ کیا تو اس نے مقابلے میں فوجیں بھیجنے کے بجائے بند کمرے میں ختم خواجگان کرا دیا تاکہ شاید اس طرح یہ بلا ٹل جائے، مگر لاتوں کے بھوت باتوں سے کبھی ٹلتے ہیں! نتیجہ یہ ہوا کہ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔

سعیدہ۔ تم حد سے بڑھ رہی ہو۔ کیا خدا کے کلام میں اثر نہیں؟ کیا آیاتِ قرآنی سے بلائیں نہیں ٹل سکتیں؟

نسیمہ۔ آپا تم مجھے غلط سمجھی ہو۔ میں دعاؤں اور آیات کی برکت سے کب انکار کرتی ہوں لیکن مریض کے لئے صرف دعا کرنا اور دوا نہ کرنا مفید نہیں۔ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ باقی رہا اولیاء کی کرامات کا معاملہ تو اسے چھوڑ دو۔ یہ محیر العقول واقعات کبھی کبھی خدا کے حکم سے ظہور میں آتے ہیں۔ ہر بشر کو خداوندِ کریم نے یہ اختیارات اور خوبیاں نہیں بخشیں۔ اگر عملی جد وجہد غیر ضروری ہوتی تو اللہ تعالیٰ قرآن میں یہ فرماتا کہ اے مسلمانو! جب کوئی تم پر حملہ کرے تو فلاں آیت پڑھ لیا کرو لیکن اس کے برعکس اس کا حکم یہ ہے کہ اے مسلمانو! گھوڑوں کی چھاؤنیاں قائم کرو اور مناسب ہتھیار جمع کرو تاکہ خدا کے دشمنوں پر تمہارا رعب چھا جائے۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ جہاد کی تلقین کیوں فرمائی ہے؟ اور ظاہر ہے کہ اس سے مراد جہاد بالنفس نہیں جیسا کہ نام نہاد صوفی کہا کرتے ہیں بلکہ جہاد بالسیف ہے، اس لئے کہ ہر جگہ جہاد کے ساتھ قتل ہونے اور

قتل کرنے کا ذکر آتا ہے۔ باقی رہا ان صوفیوں کا جہاد تو بھئی اس کا قرآن میں ذکر نہیں۔ میں فاقہ کرتا ہوں، جہاد ہے۔ زمین پر سوتا ہوں یہ بھی جہاد ہے۔ ایک ٹانگ پر کھڑا ہوتا ہوں تو یہ بھی جہاد ہے۔ اُن سے کوئی کہہ دے کہ حضرت یہ تمام جہاد میدانِ جنگ میں پیش آہی جاتے ہیں اور وہ بھی بادلِ ناخواستہ۔ رات کو جاگنا اور خدا کی یاد میں بیٹھے رہنا بھی تو جہاد بالنفس ہے لیکن اس جہاد کو خدا نے جہاد بالسیف پر قربان کر دیا ہے۔ حکم ہے کہ عبادت کی متعدد راتیں اس ایک رات پر نثار ہیں جو مجاہد خدا کی راہ میں میدانِ جنگ میں بسر کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اولیاء کو بہت سی قدرتیں حاصل ہیں۔ مگر یاد رکھو کہ وہ خدا کی رضا کے بغیر کبھی کوئی قدم نہیں اُٹھاتے۔ عوام اُن کے تصرفات سے جبھی مستفید ہو سکتے ہیں جبکہ وہ قرآنی احکام کی پیروی کریں ورنہ کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔

سعیدہ - اجی مفتی صاحب ٹھیک ہے۔ اب اس بحث کو چھوڑیئے۔

نسیمہ - اعتراض تو جناب ہی نے کیا تھا جس کا مفصل جواب دینا پڑا۔

سعیدہ - اچھا بھئی تم جیتے ہم ہارے۔ (تم جوتے ہمارے)

نسیمہ - خیر ہم تمہارے جوتے ہی سہی، بھائی خالد کے طفیل ہیں۔

سعیدہ - (ہنس کر) اچھا یوں نہیں، بلکہ تم جیتے ہم ہارے۔

نسیمہ - شکریہ۔

سعیدہ - بھئی اب سو جاؤ نا! رات بہت جا چکی ہے۔ سردار تو شاید سو چکی ہوگی۔ اس نے بحث میں حصہ نہیں لیا۔

نسیمہ - ہاں سو چکی ہے بے چاری، تو میں بھی چلی۔
سعیدہ - اللہ نہ کرے۔ ابھی تو بہت سے کام ہیں مجاہدہ سے ہمیں۔
نسیمہ - تشکریہ۔ شب بخیر۔
اس کے بعد کمرے میں خاموشی چھا گئی اور ہلکے ہلکے خرّاٹے گونجنے لگے۔

جُدائی

(۱)

دوسرے دن جب صبح سویرے سردار اپنے کام کاج سے مصروف ہونے لگی تو سعیدہ نے اُسے یہ کہہ کر روک دیا:۔

سعیدہ۔ سردار بہن، تم رہنے دو میں خود ہی کر لوں گی۔

سردار۔ (ہنس کر) جس کا کام اسی کو ساجھے۔

نسیمہ۔ بی صاحبہ آپ تکلف چھوڑیئے ہم بھی مردِ مجاہد ہیں سبھی کچھ کر سکتے ہیں۔

سعیدہ۔ پہلے مردِ مجاہد کا بھیس تو بدل لو ورنہ ہم مجاہدہ ہی سمجھیں گے۔

طارق۔ ہاں اب پھر وقت آگیا ہے کہ بھیس بدل لیا جائے۔

اُس نے مڑ کر دیکھا تو طارق اور خالد کھڑے مسکرا رہے تھے۔ طارق نے

پھر کہا :-

طارق - محبت رائے سے جدائی کا وقت قریب آگیا ہے - میں مناسب نہیں سمجھتا کہ اُن پر بوجھ بنوں - آج ہمیں یہاں آئے ایک معقول مدت گذر چکی ہے - اس عرصے میں مخالفین نے وہ وہ سازشیں کی ہیں کہ الٰہی توبہ - ہم لوگ مصلحتاً تمہیں نہیں بتاتے رہے - ان لوگوں نے تین دفعہ مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تاکہ چچا کو ضمانت کے بیس ہزار ادا کرنا پڑیں - لیکن خدا کی مرضی سے میں محفوظ ہی رہا - اب سنا ہے کہ وہ محبت رائے اور عزت رائے کو قتل کرنا چاہتے ہیں - ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ یہاں سے رخصت ہو جائیں - چچا مانتے نہیں مگر میں نے یہ صاف صاف بتا دیا ہے کہ آج رات ہم پریم نگر سے چلے جائیں گے -

سعیدہ - (گھبرا کر) جائیں گے کہاں ؟

نسیمہ - ملکِ خدا تنگ نیست پائے مرا لنگ نیست -

خالد - (سعیدہ سے طنزاً) سن لیا نا مجاہدہ کا جواب ؟

سعیدہ - (خجالت چھپاتے ہوئے) گاڑی کے لئے پیٹرول بھی تو چاہیئے -

طارق - (مسکرا کر) اس کے لئے انتظام ہو چکا ہے - یہ کام عزت رائے کے سپرد کیا گیا تھا جو بخیر و خوبی مکمل ہو چکا ہے -

یہ باتیں سن کر سردار کچھ افسردہ سی ہو گئی تو نسیمہ نے بھانپ کر کہا :-

نسیمہ - بہن سردار ہم تمہیں چھوڑ کر نہیں جائیں گے - فکر نہ کرو -

سردار - (طارق کی طرف اشارہ کرکے) ان سے تو پوچھ لو -

سعیدہ ۔ اُن سے پوچھنے کی اُسے کیا ضرورت! یہ تو خود سالارِ اوّل ہے ۔
خالد ۔ سالارِ دوم کا عہدہ تو اب بھی خالی ہے مگر تم میں جرأت ہی نہیں ۔
طارق ۔ بھئی مذاق چھوڑو اور مختصر سی ہدایت سن لو کہ آج رات ہمیں گیارہ بجے کے قریب یہاں سے رخصت ہو جانا ہے ۔
سعیدہ ۔ پچھلے پہر کیوں نہ چلیں؟
طارق ۔ بظاہر پروگرام میں یہی وقت مقرر کیا ہے لیکن احتیاطاً ہم لوگ قبل از وقت نکلنا چاہتے ہیں ۔ ممکن ہے کہ دشمن کو ہمارے پروگرام کا علم ہو اور وہ مقررہ وقت پر ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کرے ۔ بہرحال آج رات کے گیارہ بجے ہم سب یہاں سے رخصت ہو جائیں گے ۔ تم پونے گیارہ بجے تیار رہنا ۔ خالی ہاتھ آئے تھے اور خالی ہاتھ جانا ہے ۔ اس سازوسامان سے ہرگز کوئی چیز نہ اُٹھائی جائے ۔ میرے خیال میں پروگرام کی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں ۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟
سعیدہ ۔ جی ٹھیک ہے ۔ سپاہی کو تو صرف حکم کی ضرورت ہوتی ہے ۔ تفصیل سے اُسے کیا سروکار
خالد ۔ شکر ہے کہ کبوتر کے تنِ نازک میں بھی شاہیں کا جگر پیدا ہوا ہے ۔
طارق ۔ اچھا اب تیاری کرو ۔ ہمیں بھی باہر جا کر بہت کچھ غوروخوض کرنا ہے ۔ آؤ خالد چلیں ——

ان کے چلے جانے کے بعد ان تینوں نے مل جل کر کھانا پکایا ۔ پھر غسل کیا اور نمازیں پڑھیں ۔ کچھ وظیفے بھی کئے اور نسیمہ نے تو نہ جانے کتنی سو مرتبہ آیتِ کریمہ

پڑھی۔ یہ دیکھ کر سعیدہ سے نہ رہا گیا اور کہنے لگی:۔

سعیدہ۔ کیا خوب ہے صاحب، دل میں کچھ اور زبان پر کچھ اور۔

نسیمہ۔ (حیرانی سے) یعنی؟

سعیدہ۔ یہی کہ قول اور فعل میں تضاد۔

نسیمہ۔ بھئی میں نے تو مفصل طور پر بتایا تھا کہ میں کلام کی برکت سے انکاری نہیں ہوں۔ ویسے بھی میرے قول اور فعل میں تضاد کہاں ہے۔ اب وظیفہ کرتی ہوں اور میدان میں بندوق سے کام لوں گی۔ میں دوا اور دعا دونوں استعمال کرتی ہوں۔

سعیدہ۔ یہ درست ہے۔ اچھا جس قدر ہو سکے خدا کو یاد کر لینا چاہیئے۔ نہیں معلوم کل کیا پیش آئے۔

تمام دن یہ تینوں کچھ ایسی ہی باتوں میں مشغول رہیں۔ سردار نے بچوں کو بھی نہلا دھلا کر پاک صاف کیا۔ وہ گذشتہ واقعات بھول چکے تھے۔ عمر ہی کیا تھی دو دو اڑھائی اڑھائی برس۔ کوئی نو بجے کے قریب نسیمہ نے اپنے آپ کو پھر نسیم کے سانچے میں ڈھال لیا۔ وہ بالکل سولہ سترہ برس کا نوجوان معلوم ہوتی تھی جس کے رخسار ابھی تک ڈاڑھی سے بے نیاز تھے۔ علیٰ پونے گیارہ بجے طارق اور خالہ اندر آئے اور انھوں نے پوچھا "تیار ہو۔" جواب میں تینوں نے بیک زبان کہا "ہاں۔" اس کے ساتھ ہی نسیمہ دروازے کی طرف بڑھنے لگی مگر طارق نے ٹوکتے ہوئے کہا:۔

طارق۔ حضور اس طرف سے نہیں۔ راستہ بہ تقاضائے وقت بدلا گیا ہے۔ اُوپر چھت کی طرف سے پچھواڑے گاڑی کھڑی ہے، سیڑھی بھی لگا دی گئی ہے۔ رشید، چچا محبت رائے اور عزت کھڑے ہیں۔

غرضیکہ یہ لوگ سب کے سب پچھواڑے کی طرف لپکے اور باری باری اُتر کر رات کے سنّاٹے میں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ رات بالکل خاموش اور تاریک تھی۔ جب گاڑی چلنے لگی تو محبت رائے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کی آواز بھرّا گئی۔ اس نے عزت رائے کو حکم دیا کہ گاڑی میں بیٹھ جائے اور گاؤں کی حدود سے کافی دور تک چھوڑ آئے۔ عزت بیٹھ گیا تو طارق نے گاڑی چلا دی، مگر محبت رائے چلّایا "ٹھہرو، ٹھہرو۔" لہذا پھر رکنا پڑا۔ وہ دوڑ کر قریب آیا اور کہنے لگا:۔

محبت رائے۔ تمہارے ساتھ کیا کچھ ہے؟

طارق۔ ایک اسٹن گن، ایک رائفل آپ کے ڈوگروں کا مال۔

محبت رائے۔ ہمارا تمہارا ایک ہی ہے۔ ٹھہرو ایک بندوق اور لا کر دیتا ہوں کہیں کام آئے گی۔

عزت رائے۔ اور بندوق لانے کی ضرورت نہیں۔ میں واپسی پر اپنی بندوق انھیں دیتا آؤں گا۔ مہربانی کر کے آپ گھر جائیں۔

محبت رائے۔ بس یہ ٹھیک ہے۔ جاؤ ایشور تمہاری سہایتا کرے (یعنی خدا تمہاری مدد کرے۔)

گاڑی پریم نگر کے کھیتوں کو عبور کر کے دریا کے قریب پہنچی تو عزت رائے نے دُور سے دیکھا کہ ایک سایہ ساحل کے پاس کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار بھی معلوم ہوتا تھا۔ طارق نے دیکھ کر کہا کہ یہ تھانے کا کوئی سپاہی ہوگا۔ ممکن ہے کہ رات کو گشت کے لئے نکلا ہو۔ اور کسی کا یہاں کیا کام۔ یہ سن کر عزت رائے کہنے لگا:۔

عزت رائے۔ ممکن ہے کہ آپ کا خیال درست ہو۔ بہر حال جو کوئی بھی ہے وہ

ایسی اندھیری رات میں ہمیں پہچان نہیں سکے گا۔

خالد۔ میری رائے میں یہ کوئی گاؤں کا آدمی ہے۔ ہمارا پروگرام معلوم ہو جانے پر فساد کے لئے آیا ہے، ورنہ عین پل کے قریب کھڑا نہ ہوتا۔

عزت رائے۔ اگر ہمارا راز افشا ہو چکا ہوتا تو یہ لوگ ہمیں گاؤں ہی میں روک لیتے یہاں تک آنے کی نوبت ہی نہ آتی۔

طارق۔ بڑھے چلو۔ یہ بھید خود بخود کھل جائے گا۔

چند منٹ کے بعد جب گاڑی پل کے قریب جا پہنچی تو ایک آواز آئی:۔

آواز۔ کون ہے، ٹھہرو۔

جواب۔ ڈوگرے۔

آواز۔ اصلی یا نقلی؟

جواب۔ اصلی۔

ابھی یہ سوال و جواب ہو رہے تھے کہ خالد نے طارق کے کان میں پوچھا "فائر کر دوں؟" اس نے جواب دیا "اس طرح مارنا بہادری نہیں۔ ابھی تک وہ اصلیت سے بے خبر ہے۔"

آواز۔ تم جھوٹ کہتے ہو مجھے شک ہے۔

طارق۔ تمہارا شک کس طرح دور ہو سکتا ہے؟

آواز۔ اس طرح کہ تم عزت رائے کو میرے حوالے کر دو، نہیں تو یہ گولی یکے بعد دیگرے سب کا خاتمہ کر دے گی۔ میں خوب جانتا ہوں کہ اس فوجی گاڑی کے ڈھونگ کے سوا تمہارے پاس کچھ بھی نہیں۔ محبت رائے اور اس کا بیٹا غدار ہیں پہلے

ہمارے غدار تھے، اب تمہارے بھی بن گئے۔

طارق۔ کپور کس طرح ؟ (طارق نے آواز پہچانتے ہوئے پوچھا۔)

کپور۔ پہلے انھوں نے تمہیں پناہ دے کر جنتا سے غداری کی۔ اب تمہیں نہتّا نکالکر تم سے غداری کی ہے۔

طارق۔ لیکن میں نہتا نہیں۔

کپور۔ بس رہنے دو۔ محبت رائے نے ایک دن خود ہی مجھے بتایا تھا کہ تمہارے ہتھیار پولیس کو دے دئے گئے ہیں۔ ان دنوں تمہارا شدھ ہو جانے کا ارادہ تھا اور واپسی خواب و خیال تھی۔

طارق۔ بات تو ٹھیک کہتے ہو کپور۔ جب میں پناہ کے لئے آیا تھا اُس وقت بھی تم نے مخالفت کی تھی۔ اب واپس جا رہا ہوں تو اب بھی الجھنا چاہتے ہو حالانکہ تمہیں یہ مناسب نہیں۔ میرے بچپن کے دوست ہو۔ ہم اکٹھے کھیلتے رہے ہیں۔

کپور۔ ٹھیک ہے۔ وہ وقت اب بھی میری آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ لیکن تم ایسے شخص کی پناہ میں آئے تھے جس سے میرے خاندان کی سخت عداوت ہے۔ تم عزت کو گاڑی سے اتار دو اور خود چلے جاؤ۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔

عزت۔ (جوش میں) لے میں خود ہی گاڑی سے اُترتا ہوں۔ کمینے معلوم ہوا کہ محض اس ذاتی رنجش کی وجہ سے جو ہمارے خاندانوں کے درمیان چلی آتی ہے تو ان غریب مہمانوں کا بھی دشمن بنا ہے۔

عزت یہ فقرہ مکمل کرتے ہوئے گاڑی سے نکلا ہی تھا کہ کپور نے اس پر فائر کر دیا اور وہ زمین پر گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ٹرک سے تین چار فائر فضا میں گونجے۔ پھر

چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ طارق اور خالد نے اتر کر دیکھا تو کپور کی لاش خاک و خون میں لتھڑی پڑی تھی اور عزت رائے دور کھڑا کپڑے جھاڑ رہا تھا۔

طارق۔ خدا کا شکر ہے کہ تم بچ گئے۔

عزت۔ اس کا نشانہ چوک گیا۔ اب یہ لاش دریا میں پھینک دو۔

چنانچہ کپور کی لاش دریا میں بہادی گئی۔ اس سے فارغ ہو کر طارق نے عزت سے کہا:۔

طارق۔ بھائی میرا خیال ہے کہ اب تم گاؤں کو لوٹ جاؤ۔ ویسے بھی اب ہمیں تمہاری ضرورت نہیں۔

عزت۔ کیوں جی؟

طارق۔ ہمیں خدا کا سہارا کافی ہے۔ جاؤ بھائی اب تم گھر چلے جاؤ۔

عزت۔ نہیں میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔

طارق۔ دیکھو جذباتی نہ ہو اور لوٹ جاؤ۔ ہم تمہارا احسان عمر بھر نہیں بھولیں گے۔ چچا کو میرا سلام کہنا۔ آئندہ کبھی ضرورت پڑی تو پیغام بھجوا دوں گا۔ شناختی لفظ یہ ہوگا۔

طارق نے اس کے کان میں شناختی لفظ بتا کر بہ اصرار رخصت کیا اور گاڑی پل کی طرف موڑ دی۔

(۳)

گاڑی جب دریا کی دوسری طرف چلی گئی تو طارق سوچنے لگا کہ اب کدھر کا

رخ کروں۔ دشمن کی سرزمین ہے اور طویل راستہ، اندھیری رات، نقلی وردیاں جو افشائے راز پر بدخواہوں کو اور بھی منتقم بنا دیں گی۔ مستورات کا ساتھ ہے اور معصوم بچوں کی ماں جس کا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ اپنی زندگی تو خطرے میں تھی ہی اس غریب کو بھی خواہ مخواہ وہاں سے اُٹھا لائے۔ نسیمہ بھی عجیب لڑکی ہے۔ مگر وہ کیا کرتی۔ ایک مسلمان عورت کو وہاں چھوڑ کر آنا بھی تو مناسب نہیں تھا۔

طارق چلا تو گاڑی رہا تھا مگر اس کی توجہ راستہ کے نشیب و فراز کی طرف مطلق نہیں تھی۔ وہ نہ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا کہ اچانک ایک ہچکولہ سا لگا اور گاڑی الٹتے الٹتے بچی۔ ساتھ ہی ایسے محسوس ہوا جیسے کسی کی چیخ نکل گئی ہو۔ گاڑی رُکتے رکتے کھیتوں میں اتر گئی۔ طارق نے سوچا کہ اتر کر دیکھے کہ معاملہ کیا ہے۔ لہٰذا وہ خالد اور رشید کو ساتھ لے کر گاڑی سے نکلا۔ تھوڑے سے فاصلے پر جا کر دیکھا کہ ایک عورت دم توڑ رہی تھی اس کی چھاتی سے چمٹا ہوا ایک شیرخوار بچہ مر چکا تھا طارق نے ساتھیوں سے کہا :-

طارق۔ افسوس کہ ہم ایک بے گناہ کے خون کا باعث ہوئے ہیں۔

خالد۔ ممکن ہے کہ وہ پہلے ہی سے مجروح ہو۔ آؤ دیکھیں تو سہی۔

خالد کے اس مشورے کے مطابق یہ لوگ پھر لاش کے نزدیک گئے اور اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی ظالم کی گولیوں کا نشانہ بن چکی ہے۔ رشید نے چونک کر بتایا کہ قریب ہی ایک اور نیم جاں سسک رہا ہے۔ یہ جگہ دشمن کے کسی مرکز سے متصل ہے۔ آؤ یہاں سے بھاگ جائیں۔ ابھی یہ فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ اچانک بندوق چلنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی نسیم (نسیمہ) نے چلا کر کہا کہ گاڑی پنکچر کر دی

کردی گئی ہے۔ جلدی آؤ۔ جواب میں یہ تینوں دوڑ کر گاڑی کی طرف گئے اور یہ سمجھ کر کہ دشمن قریب ہی ہے مختلف طریقوں سے ڈٹ گئے۔ ابھی ایک لمحہ بھی نہیں گزرا تھا کہ بجلیاں کوندنے لگیں سیسہ اور لوہا برسنے لگا اور انسان حیوانوں کے لہجے میں گرجنے لگے۔ ادھر سے بھی جواب دیا جانے لگا۔ طارق ہاٹن گن چلا رہا تھا اور خالد رائفل نسیم اور رشید کے پاس عزت رائے اور کپورو والی بندوقیں تھیں۔ خالد نے فائر کرتے ہوئے کہا:۔

خالد۔ یہ کسی سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت یہاں آئے ہیں۔

طارق۔ سارا راز کھل جائے گا۔ سردست زندگی کی خیر مانگو۔

رشید۔ ہمارے کارتوس تو ختم ہوئے جا رہے ہیں۔

طارق۔ رات کی وجہ سے بارود ضائع ہو رہا ہے۔ دن ہوتا تو ایک ایک گولی نشانے پر لگتی اور یہ بدبخت بھاگ چکے ہوتے۔

اس طرف فائرنگ کے وقت کچھ ایسی ہی باتیں ہو رہی تھیں اور اس طرف طرح طرح کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ عجیب عجیب گالیاں بکی جا رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ دشمن ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ رات کے سناٹے میں یہ شور دور دور تک سنا جا رہا تھا اور یہاں وہاں منڈلانے والے دشمن جتھے اس طرف متوجہ ہو رہے تھے۔ جب شکست کے آثار نظر آنے لگے تو طارق نے کہا:۔

طارق۔ سعیدہ، سردار نسیم بارود ختم ہو رہا ہے۔ میری رائے ہے کہ اب میں خود اپنے ہاتھوں تمہاری جانیں تمہاری عصمت پر قربان کر دوں تاکہ ——

ایک آواز۔ تاکہ اور کوئی مزہ نہ لوٹے۔

اس کے ساتھ ہی کوئی تین تین چار چار جوان ان میں سے ہر ایک پر ٹوٹ پڑے

اور پل بھر میں سب کی شکیں بندھ گئیں۔ آن کی آن میں مشعلیں روشن ہوگئیں اور روشنی میں ایک ایک چہرے کے خد و خال بغور دیکھے گئے۔ انھیں سعیدہ اور سردار ہی دو عورتیں نظر آئیں۔ بے چاری سردار کے معصوم بچے گھبرا کر چلائے تو ایک دشمن نے کہا:۔

دشمن ۔ لو یہ عذاب بھی ساتھ ہے۔

ایک اور ۔ جوان، یہ عورتیں ہماری سیوا کریں گی یا ان کی؟

دوسرا ۔ چلو رہنے دو کیا ہرج ہے۔

ایک ۔ بھئی اپنے ہی رنگ میں بھنگ ڈالو گے۔ ہمیں کیا۔

ایک اور ۔ سانپ کے بچے کو کچل دینا ہی بہتر ہے۔

سردار ۔ (عاجزی سے) مگر یہ تو سکھ بچے ہیں۔

دشمن ۔ حرامی ہوں گے۔ کبھی یہ بھی ہوا ہے کہ ماں مسلمان ہو اور بچے سکھ۔ پکڑو جوان۔

اس اشارے کے ساتھ ہی ایک معصوم کے پیٹ میں نیزہ بھونک کر اُسے ظلم و ستم کا علم بنا دیا گیا۔ سردار نے چیخ چیخ کر کہا:۔

سردار ۔ ہائے میرا بچہ میرا بچہ۔

دشمن ۔ تو تو ابھی کہتی تھی کہ یہ سکھوں کا بچہ ہے۔

ایک اور ۔ (دوسرے معصوم کی طرف اشارہ کر کے) اس کا کیا اچار ڈالو گے، کرو کام تمام۔ یہ بوجھ ہم سے نہیں اُٹھے گا۔

اس کے ساتھ ہی ایک سنگدل نے جلتی ہوئی مشعل بڑھائی اور معصوم کی آنکھوں میں گھسیڑ دی۔ اتنی بڑی مشعل اور معصوم کی ننھی سی آنکھیں۔ مقصود تو اُسے ہلاک کرنا تھا۔ غریب کا تمام چہرہ جل کر کباب ہو گیا اور اس نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔

کیا یہ وحشت اور بربریت کی انتہا نہیں تھی؟ دشمن غیر دشمن، مجرم غیر مجرم کی تمیز ہی نہ رہی۔ جس وقت اس کام سے فارغ ہوئے تو ایک دشمن نے رالیں دیتے ہوئے کہا:۔

دشمن۔ میری مرضی ہے کہ ان مردوں کو بھی یہیں ٹھکانے لگا دو۔

دوسرا۔ نہیں تمہیں خبر نہیں، کیور نے یہ بھی کہلایا تھا کہ لالہ محبت رائے ان کے عوض ایک معقول رقم ادا کر دے گا۔ ابھی انھیں ڈیرے پر چلو۔ ویسے یہ لوگ ہیں بھی بڑے بہادر۔ ذرا اس لونڈے کی طرف دیکھو کس طرح گھور رہا ہے۔

نسیم نے یہ سن کر آنکھیں دوسری طرف پھیر لیں۔

اس گفتگو کے بعد حملہ آور قیدیوں سمیت روانہ ہو گئے۔ طارق اور خالد نے محسوس کیا کہ دشمن بھی کافی سے زیادہ ہلاک ہو چکے ہیں۔ مشعلوں کی روشنی میں لاتعداد دشمن دم توڑتے، تڑپتے اور کراہتے نظر آئے۔ بالآخر قافلہ دور چلا گیا۔ نعرے اور جے کارے مدھم پڑ گئے حتیٰ کہ مشعلیں ٹمٹماتے ہوئے ستاروں میں تبدیل ہو گئیں۔

جب صبح ہوئی تو میدان میں ایک جلی ہوئی فوجی گاڑی اور بے شمار جھلسی ہوئی لاشوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ البتہ گدھ موجود تھے جو اچھل اچھل کر خوش ہو رہے تھے کہ انسان کتنا متواضع ہے کہ ہمارے لئے اپنے بے گناہ بھائیوں کو ہلاک کر دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

سورج نے جب ذرا آنکھ کھولی تو اس کی نظر دور ایک خراب و خستہ کوٹھری میں چارپائی جس کے نصف حصہ میں بھوسے کا ڈھیر تھا۔ اور چھت پر جابجا جالے لگے ہوئے تھے۔ یہ چھت فرش سے بمشکل آٹھ نو فٹ اونچی تھی۔ در و دیوار پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا کہ یہ کوٹھری چھپکلیوں کی چھاؤنی ہے۔ جالے میں پھنسی ہوئی

مکھیوں اور مچھروں کو نجات دلانے کے لئے چھپکلیاں خدمتِ مگس کر رہی تھیں۔ ایک کونے میں دو لپیٹے ہوئے بنڈل پڑے تھے۔ ان میں سے ایک کو حرکت ہوئی۔ اُس نے دوسرے کو ہلاتے ہوئے کہا:۔

سردار بہن اُٹھو کب تک روتی رہو گی؟

"جب قسمت میں رونا ہی لکھا ہے تو انسان کیا کرے"۔

سردار نے جواب دیا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"بچوں کا خیال آتا ہے تو چاہتی ہوں کہ خودکشی کر لوں"۔

"خودکشی اسلام میں منع ہے۔" سعیدہ نے جواب دیا۔

"گویا ع نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے۔ خودکشی کریں تو حرام اور جو مصائب برداشت کرنے کے لئے زندہ رہنا چاہیں تو ناممکن"۔

سعیدہ۔ قسمت کیا ہر شخص کو قسامِ ازل نے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا نالہ تو پروانے کو جلنا
غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

سردار۔ پروانے کے لئے بھی خودکشی حرام قرار دی جاتی۔ یہ پابندی ہمیں سوختہ جانوں پر کس لئے لگا دی گئی۔ افسوس اس چھت کے ساتھ کوئی رسی بھی تو نہیں ورنہ پھانسی جھولتی اور جو کہیں دیا سلائی ہوتی تو اس بھوسے کو آگ لگا کر خود بھی جل مرتی۔ اے خدا تو نے یہ کیا کیا کہ مجھ پر یہ ظلم و ستم کا دروازہ کھول دیا۔

سعیدہ۔ ہوں ہوں کیا کہہ رہی ہو! خدا ظالم نہیں۔

سردار۔ (سعیدہ کی بات کا جواب دیئے بغیر) آخر میرا کیا قصور تھا جس کی یہ سزا مل رہی ہے اور ان غریب مسلمانوں کا کیا گناہ ہے جس کی پاداش میں انکی لاشیں گدھ نوچ رہے ہیں اور کتے کھا رہے ہیں۔ وہ معصوم عورتیں جنھیں کبھی چشم فلک نے بھی نہیں دیکھا تھا میدانوں میں بے گور و کفن پڑی ہیں۔ کیا ہماری خطا یہی ہے کہ ہم محمدی ہیں، تیرے محبوب کے نام لیوا ہیں۔ یہ تیری محبت کا انعام ہے۔ تیری اطاعت کا صلہ ہے۔ تو تو رحمٰن اور رحیم کہلاتا تھا آج تیری رحمت کہاں ہے۔ وہ تلاطم کیوں نہیں ہوتی تاکہ ظالم کے ظلم کی لٹیا ڈوب جائے۔ تو اگر جبار ہے، قہار ہے تو کیا ہم مسلمانوں کے لئے، حسینؑ کے لئے، علی اصغر کے لئے۔ آہ یہ سب کچھ تو نے اپنوں ہی کے لئے مخصوص کر رکھا ہے اور دوسروں کے لئے زر و جواہر، عیش و آرام ہیں، جاہ و حشمت ہے، حکومت ہے اور دولت ہے۔

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر (اقبال)

اے ہم سادہ لوحوں کو صرف جنت کے وعدے پر ٹرخانے والے خدا، آ ذرا زمین پر اتر کر آ۔ عرش کی بلندیوں کو چھوڑ اور فرش کی پستیوں میں دیکھ، تیرا دین لُٹ رہا ہے، دین والے لُٹ رہے ہیں۔ جام مٹ رہا ہے متوالے مٹ رہے ہیں۔ بادۂ کوثر کے پینے پلانے والے مٹ رہے ہیں۔ جان دے رہے ہیں تیرا نام نہیں چھوڑتے۔ آن دے رہے ہیں اسلام کی شان نہیں چھوڑتے۔

ان میں شرابی بھی ہیں زانی بھی، ان میں نمازی بھی ہیں اور بے نمازی بھی، اچھے بھی ہیں بُرے بھی مگر سب کے سب تیرے نام پر مٹ رہے ہیں۔ انھیں گھروں سے کوسوں دور جانا منظور ہے۔ وطن چھوڑ کر غریب الوطنی مرغوب ہے۔ ملک و املاک چھوڑیں گے لیکن تیرے اسلام سے منہ نہیں موڑیں گے۔ یہ جئیں گے تو مسلمان جئیں گے۔ مریں گے تو مسلمان مریں گے، خواہ انھیں قطب شمالی میں جانا پڑے یا جنوبی میں۔ آہ ایسے باوفاؤں سے یہ بے اعتنائی کہ غیروں کے ظلم و ستم پر چھوڑ کر خود عرش سے خاموشانہ جھانکتا ہے۔ آج تیری وہ ابابیلیں کہاں ہیں جو کعبے کی حفاظت کے لئے ابرہہ کے ہاتھیوں پر ٹوٹ پڑی تھیں۔ آج تو ہر مسلمان کا دل ایک کعبہ ہے۔ آج ان ابابیلوں کو حکمِ جہاد کیوں نہیں ملتا۔

سردار پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ آنسوؤں کا طوفان تھا کہ تھمتا نہیں تھا۔ سعیدہ کی آنکھیں بھی ساون بھادوں کی طرح برس رہی تھیں۔ ان بدنصیبوں کے سر پر دوپٹہ بھی تو نہیں تھا جس سے آنسو پونچھ لیتیں۔ اسی اثنا میں دروازہ کھٹ سے کھلا اور دو بہت ہی خوفناک درندے ننگی تلواریں لئے داخل ہوئے۔ کردار کو تو چھوڑیے وہ شکل و شباہت ہی سے درندے معلوم ہوتے تھے۔ بعض درندوں میں بھی وجاہت ہوتی ہے۔ شیر ہی کو دیکھ لیجئے۔ اس میں وجاہت، تمکنت اور ایک قسم کی شاہانہ بے نیازی موجود ہے۔ مگر یہ درندے ایسے نہیں تھے۔ اُنکی شکل و صورت ہی سے خباثت ٹپکتی تھی، دیکھنے سے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ ان کے سروں کے بال بے تحاشا لمبے اور کھلے ہوئے تھے اور ڈاڑھیاں اس

بے ترتیبی سے بڑھی ہوئی تھیں کہ گویا افریقہ کی گھاس ہو جس میں بڑے بڑے قد آور حیوان بھی چھپ جاتے ہیں۔ یہ ملعون مادر زاد ننگے تھے۔ تمام بدن غلیظ بالوں سے چھپا ہوا تھا۔ ان معصوم عورتوں نے انھیں دیکھا تو دیوار کے ساتھ اس طور سے لگ گئیں کہ گویا وہ انھیں اپنی آغوش میں جذب کرے گی۔

ایک درندے نے سردار کا بازو کھینچتے ہوئے کہا:۔

درندہ۔ ڈرتی کیوں ہو۔ ہم تو تمہیں ڈھونڈ کر کے لائے ہیں۔

سردار جو پہلے مضمحل سی تھی نہ جانے کس جوش سے اُٹھی اور اس نے بازو چھڑا کر اس درندے کے ایسا مکا رسید کیا کہ وہ بدبخت شرابی ڈگمگاتا ہوا دوسرے شرابی پر جا گرا۔ سعیدہ خوف و ہراس سے بے ہوش ہو چکی تھی۔ اُسے کچھ بھی علم نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ شرابی سنبھلا تو اس نے اپنے ساتھی کو اس طرح مخاطب کیا:۔

شرابی۔ جوان اس طرح کام نہیں بنے گا۔

دوسرا شرابی۔ کام بن تو جائے لیکن تو ہمارا کہا نہیں مانتا۔ تو تو اس سے اس طرح پیار کرتا ہے جس طرح وہ تیری بیٹی ہے۔

پہلا شرابی۔ خیر بیٹی تو نہیں، مگر ہو بہو میری چھوٹی بہن سنتو سے ملتی جلتی ہے۔

یہ فقرہ ابھی ختم ہوا ہی تھا کہ سردار ایک بار پھر شیرنی کی طرح جھپٹی اور اب کی اس نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک شرابی کی گردن دبوچ لی اور اس زور سے دبائی کہ ظالم کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ زبان باہر نکل آئی۔ مگر دوسرے شرابی کی تلوار نے اس کی جان بچالی۔ سردار کے دونوں ہاتھ کٹ کر گر پڑے اور وہ تڑپ کر بے ہوش ہو گئی۔ اس کے بعد وہ دونوں درندے اُن کے بیہوش جسموں

کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس وقت آسمان پر ایک تاریک آندھی نمودار ہوئی۔ دور دور تک کائنات پر اندھیرا چھا گیا اور سورج نے شرم کی وجہ سے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔ تاریکی اتنی بڑھی کہ اس ابلیسی کوٹھری میں ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ زمین و آسمان کے شیطان اپنی کامیابی پر خوش تھے۔ گناہ نے نیکی کو شکست دیدی تھی اور خدا مصلحتاً خاموش تھا۔ آندھی اڑ اڑ کر کائنات کے سر پر خاک ڈال رہی تھی۔

پھر جب یہ مظلوم عورتیں ہوش میں آئیں تو وہ ابلیس جا چکے تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ وہ برہنہ ہیں اور ان کے جسم جھنجھوڑے جا چکے ہیں۔ اُن کی دولتِ عصمت لٹ چکی ہے۔ اُن کا عضو عضو درد کر رہا تھا۔ سردار کو جب اپنے ہاتھوں کے کٹ چکنے کا احساس ہوا تو وہ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگی۔ تڑپی، چیخی چلائی۔ وقتی طور پر سعیدہ کو اپنی عصمت کے لٹنے کا غم بھول گیا اور وہ تڑپتی ہوئی سہیلی کی طرف متوجہ ہوئی۔ اپنی قمیص پھاڑ کر اس کے زخمی بازوؤں پر باندھ دی اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ وہ ایک نامعلوم مقام پر قید تھیں۔ نہیں معلوم کہ یہ مقام کسی آبادی میں تھا یا ویرانے میں۔ سردار رو رہی تھی اور سعیدہ خالق ارض و سماں سے مصروفِ گفتگو۔ وہ کہہ رہی تھی۔ اے خدا تو دیکھتا ہے کہ ہمارا کیا حال ہے۔ ہم سمجھتی تھیں کہ تو ہمارا محافظ ہے۔ ہم تیرے ہیں تو ہمارا ہے۔ لیکن یہ خیال خام ثابت ہوا۔ آہ گوہرِ عصمت چھن جانے سے پہلے موت ہی دیدی ہوتی جب ہوش لے لئے تھے تو پھر بیدار کیوں کیا تھا۔ کیا یہ دکھانے کے لئے کہ تم پر ہماری نعمتیں کن کن بھیانک طریقوں سے نازل ہوتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ تو مظلوموں

بیکسوں کا مولا ہے، بے سہاروں کا سہارا ہے مگر آج دید شنید سے مختلف نکلی۔ تو زبردست کا ساتھی اور ظالم کا دوست ہے۔ تو نے مسلمان کا خون پانی کی طرح بہایا، ہماری عفتیں برباد کرا دیں۔ یہ سب کچھ تیرے ایما سے ہوا ہے۔ تیری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ نہ جانے اس میں کیا مصلحت ہے۔ اے خدا رحم کر، اپنے قہر کی قوتوں کو سمیٹ لے اور ان طاغوتی لشکروں کو واپس بلا لے جو شہر بہ شہر، قریہ بہ قریہ مسلمانوں کا خون بہا رہے ہیں۔ مانتی ہوں کہ ہم خطا کار ہیں، گنہگار ہیں اور یہ سب کچھ ہمارے اعمال کی سزا ہے۔ مگر اب تو سزا کی بھی حد ہو چکی ہے۔ رحم کر اور اپنے حبیبؐ کے طفیل بخش دے۔

رحم کر اپنے نہ آئینِ کرم کو بھول جا
ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا (حشر)

آخر تو رحیم بھی ہے رحمٰن بھی، غفور بھی ہے غفّار بھی۔ امتِ مرحوم کے ہم بدکردار مجرموں پر رحم کر۔ ہم نفس کے بندے ہیں، مجبور ہیں، ناتوان ہیں، بھول جاتے ہیں۔ آخر انسان ہیں، خطائے مجسم ہیں پھر بھی تیری نظرِ کرم کے امیدوار۔ تیرے سوا ہمارا کوئی نہیں ہے۔ آہ تو بھی منہ پھیرے ہوئے ہے ورنہ ہماری یوں گت نہ بنتی۔ آج ہم بے در اور بے پر نہ ہوتے۔ التجا ہے سو بار التجا ہے کہ ہمیں بخش دے اور ان موذی ظالموں کے چنگل سے بچا لے، اپنی رحمت کے دامن میں چھپا لے۔

اے خدا دامانِ رحمت میں چھپا لے تو ہمیں
احمدِ مرسل کے صدقے میں بچا لے تو ہمیں

بجز ترے اب مونس و ہمدم ہمارا کون ہے
بے کسوں کا غم نصیبوں کا سہارا کون ہے (وکی وارثی)

وہ دیر تک روتی رہی۔ وحشیوں کی طرح کبھی خدا کو جلی کٹی سناتی اور کبھی التجائیں کرتی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دماغ کا توازن قدرے بگڑ گیا ہے۔ ایک دم پھر دروازہ کھلا۔ اب کی ایک نوجوان عورت کچھ روٹیاں اور لسی کا ڈول لے کر آئی۔ وہ پہلے گھور گھور کر سعیدہ کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اچانک بیٹھ کر کہنے لگی:۔

عورت۔ لو بہن روٹی کھالو۔ ساتھ والی کو بھی جگاؤ۔ نہ جانے کب سے بھوکی ہوگی۔

پھر اس نے خود ہی سردار کو ہلایا مگر کہاں۔ وہ تو اب ایسی نیند سو چکی تھی جسے قیامت کا شور و غوغا ہی اچاٹ کرے گا۔ یہ دیکھ کر سعیدہ نے کہا:۔

سعیدہ۔ لو اس کی تو خدا نے سن لی۔ اب میں بدنصیب ظلم و ستم کے لئے زندہ رہ گئی ہوں۔

عورت۔ اب تم پر بھی کوئی ظلم نہیں کرے گا لیکن ایک شرط ہے۔

سعیدہ۔ کیا؟

عورت۔ تھوڑی سی روٹی کھالو۔ گذشتہ واقعات بھول جاؤ۔ تقدیر میں جو کچھ لکھا تھا وہ ہو کر رہا۔ یاد رکھو خدا تمہیں صبر کا اجر ضرور دے گا۔

سعیدہ۔ تم کون ہو؟

عورت۔ مجھے پریمو کہتے ہیں۔ میں اس گاؤں کے ایک رئیس کی لڑکی ہوں۔ آج روٹیاں لئے کھیتوں میں سے گذر رہی تھی کہ تمہارے رونے کی آواز سنی۔

پہلے تو دیوار کے ساتھ لگ کر سنتی رہی۔ آخر نہ رہا گیا تو اندر چلی آئی۔ میں نے پرسوں سنا تھا کہ مہنگا مذہبی دو عورتیں اغوا کر کے لایا ہے اور اس نے گاؤں سے باہر کہیں چھپا رکھی ہیں۔ یہ کوٹھری گاؤں سے نصف میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ پہلے یہاں چند گھر آباد تھے مگر اب تو مدت سے یہ احاطہ ویران پڑا ہے۔ میرے پتا جی بہت نیک دل ہیں۔ وہ اکثر ایسے واقعات سن کر رو دیا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا بابے نانک کی تعلیم بھول چکی ہے جلدی تباہ ہو جائے گی۔ وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ چلو میں تمہیں گھر لے چلتی ہوں اور اس بات کا ذمہ لیتی ہوں کہ تمہارا بال بیکا نہیں ہو گا۔

یہ باتیں سنیں تو سعیدہ نے سردار کی نعش کی طرف دیکھا اور پریمو بھانپ کر کہنے لگی۔

پریمو۔ اس کی چنتا نہ کرو۔ گاؤں میں کچھ مسلمان موجود ہیں جو ہماری حفاظت میں رہنے کا عہد کر چکے ہیں۔ انھیں بھجوا کر اسے دفن کرا دوں گی۔ بس چلو اٹھو دیر نہ کرو۔ لو یہ میری چادر لے لو۔ میرے سر پر دوپٹہ بھی تو ہے۔

کہتے ہیں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ بس اسی لحاظ سے سعیدہ نے اس دعوت کو غنیمت سمجھا اور سردار کی لاش پر فاتحہ پڑھ کر پریمو کے ساتھ چلی گئی۔

(۳)

پریمو کا گاؤں کوئی خاص بڑا نہیں تھا۔ ہزار پندرہ سو کی آبادی تھی۔ گاؤں کے مالک سکھ تھے اور یہ ایک ہی خاندان کے رکن تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ رقبہ پہلے کبھی

مسلمانوں کی ملکیت تھا لیکن کسی نہ کسی طرح سکھوں نے خرید لیا۔ یہ لوگ بڑے صلح جُو اور نیک تھے۔ گاؤں کے مسلمان لوگوں کی روزی کا ذریعہ مزدوری تھی۔ اور اب تو یہ لوگ، بہ تقاضائے حالات پاکستان جا چکے تھے۔ البتہ پانچ سات گھر ہنوز یہاں یہیں آباد تھے جن سے مقامی سکھوں نے کہہ دیا تھا کہ بھئی جانا ہے تو جاؤ اور جو رہنا ہے تو بڑے شوق سے رہو۔ تم ہمارے ہو اور ہم تمہارے ہیں۔ تمہاری بہو بیٹیاں ہماری بہو بیٹیاں ہیں۔ ہم تمہارے لئے ہمیشہ سینہ سپر رہیں گے۔ یہ لوگ اتنے اچھے تھے کہ انھوں نے مہنگے مذہبی اور اس کے ساتھی کو اس جرم کی پاداش میں کہ وہ دو مسلمان عورتوں کو اُٹھا لائے ہیں گاؤں بدر کر دیا تھا اور وہ اپنی جان بچانے کے لئے بھاگ چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ شیطان دوسری بار اس کوٹھری میں نہیں گئے۔ اگر پریمو سعیدہ کو نکال کر نہ لاتی تو بے چاری وہیں پڑی پڑی گل سڑ کر مر جاتی۔ یہ سمجھو خدا نے اس کی فریاد سن لی اور رحمت کا فرشتہ پریمو کے بھیس میں بھیج دیا۔ پریمو کے باپ کی حویلی اچھی تھی۔ جب چودھری سردار سنگھ آیا تو پریمو نے سعیدہ کی داستان سنائی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے سعیدہ کو بلا کر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر کہا:-

چودھری سردار سنگھ۔ بیٹی تمہارے آنے سے مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بھگوان میرے گھر آئے ہیں۔ یہ ہے بھی ٹھیک کیونکہ میرے عقیدے کے مطابق وہ ہر انسان میں جلوہ افروز ہیں۔ تم یہاں کسی قسم کا ڈر محسوس نہ کرنا۔ سارے سکھ ظالم اور ڈاکو نہیں اور نہ ہی سارے مسلمان حاجی نمازی ہیں۔ سکھوں نے غلط چال چلی ہے۔ اب وہ مغربی پنجاب

میں کروڑوں کی جائداد سے محروم ہو جائیں گے۔ اچھا نہیں کیا جو کرتا ہے سو بھرتا ہے۔ تم آج سے میری دوسری بیٹی ہو۔ تمہاری پرورش مجھ پر فرض ہے۔ پرمیو جاؤ بچی بہن کو نہلا دھلا کر اچھے سے کپڑے پہنا دو۔ بالکل تمہارے جسم جان کی ہے۔

یہ سنتے ہی سعیدہ رو پڑی اور پرمیو جھکتی ہوئی اندر لے گئی۔ اندر جاتے ہی سعیدہ نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ پرمیو نے بڑی لجاجت اور منت سے چُپ کرایا اور رونے کی وجہ پوچھی۔ سعیدہ نے کہا:۔

سعیدہ۔ کچھ نہیں اپنا گھر بار ماں باپ یاد آ گئے تھے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے ہم کیا تھے اور اب کیا ہو گئے۔ جب پتا جی نے بیٹی کہا تو مجھے اپنے ابا کا خیال آ گیا اور تمہاری بہن بنتے ہوئے اپنی مرحومہ بہن کا جو شہید ہو گئی تھی۔

پرمیو۔ ہاں تقدیر میں یوں ہی لکھا تھا۔ اب یہ باتیں بھول جاؤ۔

سعیدہ۔ بھولنا بھی تو اپنے بس کی بات نہیں۔ رفتہ رفتہ بھول جاؤں گی۔ ہاں تم مردار کی لاش کا کیا کیا تو نے؟

پرمیو۔ دفن ہو چکی ہو گی۔ میں نے اسی وقت آدمی بھیج دئے تھے۔ شام کے وقت اس کی قبر پر چلیں گے۔ کیوں چلو گی نا۔ قبرستان بالکل نزدیک ہے۔

سعیدہ۔ تو کیا قبرستان میں دفن کیا گیا ہے۔ یہ تو بہت اچھا کیا تو نے۔ خدا تجھے اَجر دے گا۔

پرمیو۔ یہاں گورستان میں ایک سید جی کی بھی قبر ہے۔ انھیں کے نام پر گاؤں کو سید والی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے یہی اس رقبے کے مالک تھے۔ یہ سید

صاحب بڑے کرنی والے ہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ موہن سنگھ نے جو میرا چچیرا بھائی ہے قبر کی بے حرمتی کی اور لات ماری۔ بس اُسی دن گھوڑے سے گر پڑا اور وہی لات ٹوٹ گئی۔ ہزار علاج کے باوجود بھی درست نہ ہوئی اور کٹوانی پڑی۔ اس کے علاوہ اور بھی ہزاروں باتیں دیکھنے میں آئی ہیں۔ ہمارے گھر میں مدتِ مدید سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ ہر شب وہاں چراغ جلاتے ہیں اور ہر مہینے ختم کراتے ہیں۔ تقسیم ملک سے کوئی دو مہینے پہلے سید جی میرے پتا اور گاؤں کے اور دو تین بزرگوں کو جو ہمارے رشتہ دار ہی ہیں خواب میں نظر آئے اور کہنے لگے لو بھئی اب ہم یہاں سے جا رہے ہیں، کبھی کبھی ملنے آجایا کریں گے۔ اس روز صبح سویرے ہی میرے پتا جی نے کہا کوئی خواہ کتنی ہی مخالفت کرے پاکستان بن کے رہے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ پاکستان بنا لیکن یہ معلوم نہیں کہ سید صاحب بھی چلے گئے ہیں یا ابھی تک اسی سرزمین میں مقیم ہیں۔ ہم تو بدستور ان کی سیوا کریں گے۔ آخر کیوں نہ کریں اُن کے مزار پر بھی تو وہی کلمے لکھے ہیں جو ہم نے گورونانک دیو کے چولے پر دیکھے تھے۔ کوئی کچھ ہی کرے حقیقت چھپانے سے کبھی نہیں چھپتی۔ ہاں ایک بات اور یاد آئی کہ ایک مذہبی کو شرارت جو سوجھی تو اس نے سید جی کے مزار کے قریب پیشاب کر دیا۔ اس رات سید جی نے میرے پتا سے خواب میں کہا کہ دیکھو فلاں شخص ہمارے استھان کے پاس پیشاب کر گیا ہے اور ہماری جائے نماز ناپاک ہو گئی ہے اُسے سمجھاؤ ورنہ ٹھیک نہیں ہو گا۔ پتا جی نے چار آدمیوں میں اُسے سمجھایا مگر وہ خواب کو ایک وہم بتانے لگا اور کہنے لگا کہ کیا عجیب بات ہے کہ تم

مُردوں سے بھی ڈرتے ہو۔ پتاجی نے جواب دیا کہ تم نہیں جانتے کہ خدا کے پیارے مر کر بھی نہیں مرتے۔ لیکن وہ بدبخت مذاق اڑاتا ہوا چلا گیا۔ دوسری رات اُسے پھر وہی شرارت سوجھی۔ قبر کے نزدیک گیا ہی تھا کہ ازغیب کسی نے ایسا طمانچہ مارا کہ منہ، ناک اور کانوں سے خون جاری ہو گیا۔ دوڑتا ہوا پتاجی کے پاس آیا لیکن انھوں نے شکل دیکھنی بھی گوارا نہ کی۔ دوسری صبح وہ جہنم رسید ہو گیا۔ خدا کے بندوں میں بڑی بڑی طاقتیں ہیں۔ اچھا آج شام میں تمھیں وہاں لے چلوں گی۔ دعا مانگنا۔

سعیدہ۔ (آہ بھر کر) اب کس کے لئے دعا مانگوں۔ اب میرا کوئی نہیں۔ ایک وہ تھے لیکن اب میں اُن کے قابل نہیں رہی۔

پرمیو۔ وہ کون؟

سعیدہ۔ بھئی وہی خالد جن کی بابت میں تمھیں بہت کچھ بتا چکی ہوں۔

پرمیو۔ خدا کرے کہ وہ زندہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ ایسا دین دار شخص تمہاری مجبوری کو جرم قرار نہیں دے گا۔ آہ نہ جانے کتنی مظلوم اور ناتوان عورتیں ایسے بھیانک مظالم کا شکار ہوئی ہوں گی۔ کتنی کلیاں مسلی جا چکی ہوں گی۔ کتنے پھول خاک میں مل چکے ہوں گے۔ مگر اس میں تمہارا کیا قصور۔ تم خدا اور انصاف کی نگاہ میں اسی طرح پاکدامن اور عفیفہ ہو جس طرح کہ ماں کے پیٹ سے نکلتے وقت تھیں۔ دیکھ لینا کہ خالد تمھیں اسی طرح اپنی آنکھ کا تارا سمجھے گا۔

پرمیو دیر تک سعیدہ کو تسلی دیتی رہی۔ جب شام ہو گئی تو یہ دونوں سردار کی قبر پر جا پہنچیں۔ سعیدہ نے فاتحہ کہا۔ اور پرمیو اپنے طور پر کچھ پڑھتی رہی۔ کچھ فاصلے

پر سید صاحب کا مزار تھا۔ یہ ایک پختہ اور خوبصورت قبر تھی، سبز اور سفید ٹائلوں سے بنی ہوئی۔ تعویذ پر نام اور تاریخ وفات اور چند آیات منقوش تھیں۔ پرمیو نے بتایا کہ یہ کتبہ ان کی وفات سے ایک مدت بعد کسی نے کندہ کرایا تھا اس لئے تاریخ وفات قابلِ اعتبار نہیں۔ گورستان سے نکل کر پرمیو اُسے اس طرف لے گئی جہاں ابھی تک چند مسلمان گھر آباد تھے۔ سعیدہ کو دیکھ کر بہت سی عورتیں جمع ہو گئیں اور بڑی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ کوئی دو تین گھنٹوں کی سیر و تفریح کے بعد انھوں نے گھر کا رُخ کیا۔ یہاں کھانا تیار تھا، پلاؤ اور مرغ۔ پرمیو نے بتایا کہ یہ حلال ہے جھٹکا نہیں۔ ہمارے گھر میں تو کوئی گوشت بھی نہیں کھاتا۔ پتا جی تو پیاز سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ یہ تو محض تمہارے لئے چراغ نائی سے کہہ کر پکوایا ہے۔ بلا تکلف کھا لو۔ چونکہ پرمیو کے طرزِ سلوک سے کسی فریب کی امید نہیں تھی اس لئے سعیدہ نے خوب سیر ہو کر کھایا اور مزے کی نیند سو گئی۔

نظر تیری پریشاں کس لئے ہے
تو دنیا سے ہراساں کس لئے ہے

ہوا کیا گر نہیں غم خوار کوئی
بتا پھر فضلِ یزداں کس لئے ہے

(دلّی والی)

دیوی

(۱)

اب ذرا طارق اور اس کے ساتھیوں کا حال سنیے۔ پریم نگر کے قریب قتل و خون کے بعد دشمنوں کا لشکر مختلف جماعتوں میں بٹ گیا۔ کسی نے مغرب کا رخ کیا اور کسی نے مشرق کا۔ وہاں اس قدر شور و غوغا تھا کہ الاماں۔ افراتفری اور لوٹ کھسوٹ کی یہ حالت تھی کہ جو جس کے ہاتھ آیا اسی کو قیدی بنا کر چل دیا۔ کچھ فتنہ و فساد کا جوش، کچھ شراب اور بھنگ کا نشہ، عجب جنون اور وحشت کا سا عالم تھا۔ انھیں خود اپنے تن بدن کی خبر نہیں تھی۔ چند لوگوں نے سردار اور سعیدہ کو اغوا کیا اور ایک گروہ خالد، طارق، رشید اور نسیم کو اسیر کر کے روانہ ہوا۔ یہ جماعت دوسروں کی بہ نسبت منظم تھی۔ ان کے قبضے میں اور مسلمان بھی تھے جنھیں مختلف مقامات سے

گرفتار کر کے لایا گیا تھا۔ ان کے وحشیوں جیسے سلوک اور تحکم کے باوجود طارق اور اسکے ساتھی خوش و خرم تھے، البتہ سعیدہ اور سردار کی جدائی کا خیال طبیعتوں کو مغموم کئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ پھر بھی دشمن یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ مجاہد بالکل مطمئن اور بے فکر ہیں۔ دن بھر کے سفر کے بعد یہ قافلہ ایک پہاڑی علاقے میں داخل ہوا۔ چونکہ شام ہو چکی تھی اس لئے مشعلیں روشن کر دی گئیں۔ اب یہ لوگ سر بفلک پہاڑوں کے درمیان چکر کھاتے ہوئے ایک راستے پر چل رہے تھے۔ مشعلوں کا دھواں فضا کو مہیب اور دھندلا بنا رہا تھا۔ قافلے کے اردگرد خوفناک درختوں کے جھنڈ اس طرح کھڑے تھے کہ گویا استقبال کے لئے سپاہی متعین ہیں۔ بھیانک اور وحشتناک نعروں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ڈھول پیٹے اور ناقوس پھونکے جا رہے تھے۔ نرسنگھوں کی ملی جلی آوازوں سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا کوہستان کے جنگلوں میں ہزاروں گدھے مل کر کوئی خوفناک راگ گا رہے ہیں۔ بعض لوگ بھنگ کی ترنگ میں جمپوں سے ساز کا کام لے رہے تھے۔ اور بعض ان کے گرد حلقہ بنائے رقص کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ ان کے سر کے بال اور ڈاڑھیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ننگے اور بھدے جسم، شرابی انگارہ سی آنکھیں، مسخ اور وحشی چہرے اس ماحول کی رونق تھے۔ شور کی کیفیت نہ پوچھیے۔ اتنا شور تھا کہ پہاڑی دامنوں کے درندے بھیڑیے، شیر، چیتے اور ریچھ ڈر کر بھاگ گئے۔ ان سورماؤں کے شور و شغب سے مرعوب ہو کر بے چارے گیدڑوں نے بھی پدرم سلطان بود کا نعرہ چھوڑ دیا اور خاموشی سے غاروں میں چھپ چھپ کر دیکھنے لگے کہ آج یہ نیا ہنگامہ کیا ہے اور یہ نئی مخلوق کیسی ہے جو نہ تو انسان معلوم ہوتی ہے اور نہ حیوان۔ بعض سروں پر خنگل پھیلائے ہوئے ہیں اور بعض اپنے سروں پر مینارے اٹھائے پھرتے

ہیں۔ ان کی بلا جانے کہ یہ لوگ نہنگ ہیں، بالکل بے ضرر سے انسان، جو جنگ کی ترنگ میں وہ وہ معرکے سر کر لیتے ہیں کہ الٰہی توبہ۔

مشعلوں کی روشنی میں چمکتی ہوئی تلواریں اور جگمگاتے ہوئے نیزے آنکھوں میں چکا چوند سی پیدا کرتے اور دیکھنے والوں کے دلوں میں کپکپی سی محسوس ہوتی، دل لرزتے اور آنکھیں رو دیتی تھیں۔ مگر ہمارے بہادروں کے چہرے بدستور مسکرا رہے تھے، ان کی آنکھوں میں قطعاً خوف و ہراس نہیں تھا اور وہ باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ خالد نے ایک سرد آہ بھر کر کہنا شروع کیا:۔

خالد۔ نہیں معلوم اب ہم پر کیا گزرے گی؟

طارق نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور مسکرا کر جواب دیا:۔

طارق۔ ہماری مومیائی نکالیں گے اور کیا۔ میاں صبر کرو۔ ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے ؎

اے ولی لذتِ آزارِ قفس کیا جانو
تو گرفتار ہو تم نے ابھی دیکھا کیا ہے (دکّی وارثی)

ایک دشمن۔ بھئی اگلا جہان دکھائیں گے تمہیں، بولو اور کیا چاہتے ہو؟

خالد۔ بس ٹھیک ہے، لیکن ابھی کیوں نہیں دکھاتے؟

دشمن۔ واہ بھئی واہ، ہمیں اتنا بے وقوف سمجھ رکھا ہے کہ ——

رشید۔ (بات کاٹ کر) خیر اتنا تو نہیں لیکن سمجھ ضرور رکھا ہے۔ اچھا فرمائیے کیا ارشاد ہونے لگا تھا۔

دشمن۔ ہم ابھی سے تمہیں اگلا جہان دکھا کر تمہاری مصیبتوں کا خاتمہ کرنا نہیں چاہتے

بڑے پیار اور محبت سے ماریں گے، ایک ایک عضو کاٹ کر۔

طارق۔ بھئی واہ اس سے بڑھ کر اور نیکی کیا ہوگی۔ ہماری ایک ایک تڑپ پر جنت میں دس دس محل ہماری آسائش کے لئے وقف کئے جائیں گے۔

دشمن۔ (تعجب سے) اچھا جوان؟

خالد۔ بالکل سچ۔ جبھی تو مسلمان موت سے نہیں ڈرتا۔ مرنا منظور کرتا ہے، لیکن مذہب نہیں چھوڑتا۔

دشمن۔ نہیں میں تمہیں منزل پر پہنچتے ہی مروا دوں گا۔

رشید۔ منزل کتنی دور ہے؟

دشمن۔ اب پہنچ ہی چکے ہیں۔ اس پہاڑ کے عقب میں ایک گاؤں ہے، وہیں۔

طارق۔ تو کیا سچ مچ ہمارے لئے سزائے موت تجویز ہو چکی ہے؟

دشمن۔ بظاہر تو یہی معاملہ ہے۔ بات یہ ہے کہ جس سردار کے قبضے میں تم اسیر ہو اُسے کسی نے کہلا بھیجا تھا کہ چودھری محبت رائے تمہاری رہائی کے لئے معقول معاوضہ دے گا۔ لیکن اب یہ امید ختم ہو گئی ہے۔

طارق۔ کیوں؟ کیا چچا محبت رائے نے انکار کر دیا ہے؟

دشمن۔ نہیں۔ مرد اصول نہیں چھوڑا کرتے۔

طارق۔ تو پھر کیا ہوا؟

دشمن۔ بات یہ ہے کہ محبت رائے اور عزت قتل ہو چکے ہیں۔

طارق۔ ہوں، انسان دوستی کا انھیں یہ صلہ ملا ہے؟

دشمن۔ اب تم اپنی خیر مناؤ۔

طارق۔ (قدرے جوش میں) اے خیر کا ذکر کیا۔ ہم مرنے آئے ہیں اور مر کر رہیں گے۔
ہمیں خیر کی ضرورت ہوتی تو سیدھے پاکستان چلے جاتے، لیکن ہم موت
کی تلاش میں اس دور و دراز علاقے میں گھس آئے ہیں اور وہ کمبخت ہمارے
خوف سے چھپی بیٹھی ہے۔

دشمن۔ کون؟

طارق۔ موت اور کون! لاؤ کہاں ہے وہ، میں بھی تو دیکھوں۔ اگر تجھے اس
سے ہمدردی ہے تو جا کہہ دے:۔

دوڑ کر جان بچا چھپ کے کہیں پیارے موت
زندگی تیرے تعاقب میں چلی آتی ہے (ولی وارثی)

دشمن۔ اب مجھے یقین ہے کہ تم نہیں مرو گے۔

خالد۔ کیوں؟

دشمن۔ تمہارا ایمان بہت مضبوط ہے۔

طارق۔ پاگل ہم مر کر بھی نہیں مریں گے۔ شہید مرا نہیں کرتے۔ ہمارے قرآن
میں لکھا ہے۔

دشمن۔ (سرگوشی کے طور پر) تمہارا خدا سچا ہے۔

طارق۔ ارے بھائی تمہارا ہمارا خدا ایک ہی ہے۔

دشمن۔ (حیرانی سے) ہیں، کیا تم ٹھیک کہتے ہو؟ پھر یہ لوگ تمہیں کیوں
مارتے ہیں؟

طارق۔ جہالت اور کچھ نہیں۔

دشمن ۔ گورو نانک دیو بھی یہی کہتے تھے کہ سب کا خدا ایک ہی ہے۔

طارق ۔ وہ ٹھیک فرماتے تھے۔ اگر خدا دو ہوتے تو ایک مشرق سے سورج چڑھانے کی کوشش کرتا، دوسرا مغرب سے اور ہر روز اسی ایک بات پر لڑائی ہوا کرتی۔

دشمن ۔ بھئی واہ کیسی بات سمجھائی ہے۔ اچھا اب یوں کرو کہ خاموش ہو جاؤ۔ قافلہ منزل پر پہنچ گیا ہے۔ اگر ہو سکا تو تمہاری مدد کروں گا، ورنہ مجھے اس ظلم و ستم میں شریک نہ سمجھنا۔

طارق ۔ اچھا جو خدا کو منظور۔

اس گفتگو کے بعد یہ لوگ خاموش ہو گئے، لیکن دوسری طرف قافلے کے شور و شغب میں اضافہ ہو گیا۔ نعروں کی آوازیں بلند تر ہو گئیں۔ ڈھول زور زور سے پیٹے جانے لگے۔ نرسنگھوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ گویا سیلاب کا بند ٹوٹ گیا۔ یہ لوگ اچھلتے کودتے رقص کرتے ہوئے ایک میدان میں داخل ہوئے۔ گاؤں والے جو پہلے سے استقبال کی تیاریاں کر چکے تھے چلاتے ہوئے بڑھے اور اس ہجوم میں اس طرح شامل ہوئے جس طرح ایک شور کرتی ہوئی ندی کسی دریا میں آملتی ہے۔ میدان کے عین وسط میں ایک چبوترے پر ایک بھیانک خوفناک شکل کی مورتی کھڑی تھی، جس کا قد بیس پچیس فٹ سے کم نہیں تھا۔ آنکھیں لال سرخ انگاروں کی طرح تھیں۔ نہیں معلوم آنکھوں میں چراغ روشن تھے یا کوئی اور ہیر پھیر تھا۔ لال لال زبان باہر لٹک رہی تھی۔ ایک ہاتھ میں نیزہ تھا دوسرے میں تلوار۔ یہ ہتھیار بھی قد و قامت کی مناسبت سے بنائے گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس گاؤں میں کسی

بت پرست گروہ کی اکثریت ہے۔ چبوترے کے ارد گرد بہت سے لوگ اُچھل اُچھل کر ناچ رہے تھے۔ یہ لوگ صرف لنگوٹ باندھے ہوئے تھے۔ باقی جسم بالکل برہنہ تھا۔ سر ایسے تھے جیسے چٹیل میدان۔ سروں کے مرکز میں کوئی دو دو بالشت کی چوٹیاں لٹک رہی تھیں۔ پیٹ مشک کا نمونہ پیش کرتے تھے۔ اچانک مورتی کے ارد گرد لٹکتی ہوئی گھنٹیاں بجنے لگیں اور دشمن پُراسرار زبان میں کوئی گیت گانے لگے۔ اس کے بعد ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ پھر ایک موٹا سا دشمن چبوترے پر آیا اور بآوازِ بلند کہنے لگا:-

"لوگو! آج ماتا کو خون کی ضرورت ہے۔ صدیوں سے اس کے چرنوں میں کوئی تحفہ پیش نہیں کیا گیا۔ ہم غفلت کی نیند سوتے رہے۔ ہم نے ماتا کی تعریف میں چھوٹے نغمے گائے لیکن عملاً کچھ نہیں کیا۔ ماتا جانتی ہے کہ ہم مجبور تھے۔ وہ پھر بھی ہم پر مہربان رہی۔ آج ہم صدیوں کے بعد آزاد ہوئے ہیں اور ہمیں موقع ملا ہے کہ اسے بتا دیں کہ اے ماتا ہم انسانی زندگی بھی تیرے چرنوں میں پیش کر سکتے ہیں۔ زندگی دراصل تیرا حکم ہے، تیرا ادنیٰ سا اشارہ، پھر اسے تجھی پر کیوں نہ نچھاور کیا جائے۔ آؤ اب ہم اس کا عملاً ثبوت پیش کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت ہمیں پھر دھوکا دے کر چلا جائے اور ہماری نسلوں کو پھر صدیوں انتظار کرنا پڑے۔ تم نہیں جانتے کہ اس ہمالیہ کی دیوار کے پیچھے لامذہبوں کی ایک جماعت ترقی کر رہی ہے۔ یہ لوگ تو ایشور کو بھی نہیں مانتے اور ان کے اُصول اسلام سے ملتے جلتے ہیں۔ بھلا یہ ماتا کی خدمت کا موقع کیوں کر دیں گے۔ ان کے قدم رفتہ رفتہ بڑھ رہے ہیں۔ آؤ آج دل کھول کر یہ فرض ادا کر لیں۔ وقت تھوڑا ہے اور زمانہ گردش میں۔"

اس کے بعد ایک بڑے سے ڈھول پر چوٹ لگی اور ایک جانب سے چند

دشمن ایک مولوی کو گھسیٹ کر لائے اور اس خوفناک لیڈر سے کہنے لگے "مہاراج یہ مسلمانوں کا عالم ہے۔ سب سے پہلے ہم اسے پیش کرتے ہیں۔" کچھ توقف کے بعد مہاراج نے عالم کی طرف دیکھ کر کہا :۔

مہاراج ۔ کیا تو ہمارا مذہب قبول کرے گا؟

عالم ۔ نہیں، ہرگز نہیں۔

مہاراج ۔کیوں؟

عالم ۔اس لئے کہ تمہارے مذہب میں بھی اسی خدا کو پوجتے ہیں جس کی کہ میں عبادت کرتا ہوں محض طور طریقے کے اختلاف کی وجہ سے مذہب بدل لینا درست نہیں۔

مہاراج ۔ ہم تو ماتا کی پوجا کرتے ہیں ۔

عالم ۔میں خدا کے سوا اور کسی کو پوجنا حرام سمجھتا ہوں ۔

مہاراج ۔ تو ماتا کی توہین کر رہا ہے ۔ بدبخت تجھے معلوم ہے کہ تو کہاں ہے؟

عالم ۔ زمین پر ہوں اور کہاں ۔

مہاراج ۔ تو کاہنوں کے مرکز سامری پور میں ہے۔ یہاں جو کوئی ہمارے سحر سے منحرف ہوتا ہے اُسے موت کی نیند سلا دیتے ہیں۔

عالم ۔ وہ سحر ہی کیا جسے لوگوں سے جبراً منوایا جائے ۔

مہاراج ۔ اچھا دیوی کی طرف دیکھ ۔

عالم ۔میں خدائے عزّوجل کی طرف دیکھتا ہوں ۔

مہاراج ۔ (گرج کر) نکال دو اس موذی کی آنکھیں نکال دو۔

اس حکم کے ساتھ ہی دو وحشی اُٹھے اور انہوں نے پاس ہی دہکتی ہوئی

ایک بہت بڑی انگیٹھی سے دو آتش نما سلاخیں نکال کر غریب مولوی کی آنکھوں میں بھونک دیں۔ بے چارا گرا اور تڑپ تڑپ کر دیوی کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد اُسے پھر سہارا دے کر اُٹھایا گیا اور وہی مہاراج کہنے لگے :۔

مہاراج ۔ اب تو تیرے دل کی آنکھیں کھل گئی ہوں گی۔ ماتا تیری جان بخش سکتی ہے۔

عالم ۔ (جوش میں) اگر میرے خدا نے میری موت کا حکم فرما دیا ہے تو تیرے ماتا پتا بھی مجھے نہیں بچا سکتے۔ یہ خرافات بند کر۔

مہاراج ۔ سوچ لے ورنہ زندگی سے ہاتھ دھوئے گا۔

عالم ۔ (ڈرامائی انداز میں) اور یہ شیر جنت میں چین سے سوئے گا۔

مہاراج ۔ بدبخت گھڑی کی سوئی کی طرح وقت کے ساتھ ساتھ بدل جا۔

عالم ۔ میں ابن الوقت نہیں ہوں۔

اس کے جواب میں مہاراج نے ایک جلاد کو اشارہ کیا، تلوار چمکی اور اللہ کے بندے کی گردن کٹ کر انگیٹھی میں جا پڑی۔ فضا بھیانک نعروں اور خوفناک آوازوں سے گونج اُٹھی۔

اس کے بعد پھر ڈھول پر چوٹ لگی اور ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ چند لوگ ایک عورت کو لائے۔ اس کے ساتھ ایک شیر خوار بچہ بھی تھا جو ایک دشمن نے اُٹھایا ہوا تھا۔ جب وہ چبوترے کے سامنے لائی گئی تو مہاراج نے کہا :۔

مہاراج ۔ اے عورت کیا تو سامری مذہب قبول کرتی ہے ؟

عورت ۔ (حوصلے سے) میں بچہ نہیں کہ موتی چھوڑ کر کانچ سے بہل جاؤں۔ میں اپنے

اور تیرے دین کی حقیقت خوب جانتی ہوں۔

مہاراج۔ (بچے کو اُٹھاتے ہوئے) میں اس پھول کو ابھی دہکتی ہوئی انگیٹھی میں پھینک دوں گا۔

عورت۔ مجھے پرواہ نہیں۔

مہاراج۔ کیوں، کیا یہ تیرا نہیں ہے؟

عورت۔ یہ تو خدا کی امانت ہے۔ میں تو صرف امین ہوں۔ یہ اسے علی اصغر سے زیادہ عزیز نہیں جسے یزیدیوں نے کربلا میں شہید کر دیا تھا۔

مہاراج۔ عورت، سوچ لے۔

عورت۔ سوچ چکی۔ ہم لوگ خدا کی راہ میں ظلم و ستم سے نہیں ڈرتے۔ موت تو ہمارے لیے حیاتِ جاوید ہے۔

مہاراج۔ ہوش کر ورنہ دیوی کا قہر و غضب جوش میں آئے گا۔

عورت۔ ہم لوگ مٹی کے کھلونوں سے نہیں ڈرتے۔ جا کسی اور کو دھمکا۔

مہاراج۔ بچہ تجھے دیکھ کر روتا ہے۔ اس پر رحم کر۔

عورت۔ رحیم تو خدا کی ذات ہے اور میں خدا کی امانت خدا کو سونپتی ہوں۔

مہاراج۔ لے اس کا پاپ تیرے سر۔

اس فقرے کے ساتھ ہی اس شقی القلب انسان نے وہ ننھا سا پھول دہکتی آگ میں پھینک دیا۔ چند شعلے ذرا اوپر اُٹھے پھر بدستور سابق بیٹھ گئے۔ عورت نے باوازِ بلند کہا "لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ" اور بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ غور سے دیکھا تو اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ ایک بار پھر نرسنگھوں کا

شور اٹھا اور نعرے گونجنے لگے۔ چند لمحوں کے بعد فضا پھر خاموش ہوگئی۔ ڈھول پر چوٹ پڑی تو لوگ رشید کو کھینچتے ہوئے دیوی کے حضور میں لے گئے۔ اس وقت بھی وہ ہشاش بشاش تھا۔ وہ گردن اُٹھائے جرأت سے کھڑا ہوگیا! ایک دشمن نے مہاراج سے کہا:۔

دشمن۔ حضور اب ہم بہت خطرناک لوگوں کو پیش کرتے ہیں۔ یہ بھی اُسی ٹولی کا آدمی ہے۔

مہاراج ۔ جبھی اکڑ کر کھڑا ہے۔

دشمن۔ جناب اس گروہ کے ایک ایک آدمی نے ہمارے بیسیوں سورما مارے ہیں۔

مہاراج ۔ پھر تو انھیں شدھی کی دعوت دینا فضول ہے۔ کیوں کیا کہتے ہو؟

دشمن ۔ ٹھیک ہے مہاراج ۔

مہاراج ۔ (رشید سے) کیوں بے تو کیا کہتا ہے؟

رشید ۔ مہاراج میں آپ کے کان میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ یہ لوگ میرے بھید سے واقف نہیں۔ مجھے حکم ہی ایسا ہے مہاراج۔

(یہ کہتے ہوئے رشید کچھ مسکرا دیا)

مہاراج کسی سوچ میں ڈوب گئے۔ انھیں شک ہوا کہ کہیں یہ شخص ہمارا اپنا ہی آدمی تو نہیں۔ شاید کسی اور ضلع سے مسلمان بن کر جاسوسی کے لئے نکلا ہو۔ اس نے رشید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو وہ پھر پُراسرار سی ہنسی ہنسا۔ مہاراج نے گردو نواح کے لوگوں سے کہا تم ایک طرف ہٹ جاؤ۔ میں اس سے علیحدگی میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ سب نے تعمیل کی اور رشید سے کوئی

پانچ پانچ چھ چھ گز دور ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ مہاراج چبوترے سے اُترے تو وہ پھر مسکرایا۔ اب تو انھیں یقین ہو گیا کہ یہ کوئی اپنا ہی آدمی ہے۔ مسکراتے ہوئے قریب آئے اور پوچھا بھئی کون ہو، تمہارا شناختی لفظ کیا ہے۔ جواب میں دو فولادی ہاتھ اُٹھے اور مہاراج کی گردن سے چمٹ گئے۔ پہلے ایک آدھ چیخ نکلی پھر کچھ نہیں۔ دشمنوں نے ہر چند کوشش کی کہ اپنے لیڈر کو چھڑا لیں مگر بے سود۔ رشید نے ملعون کو اس وقت چھوڑا جبکہ اس کی رُوح کیفرِ کردار کو پہنچ چکی تھی پھر کیا تھا تیغوں، برچھوں اور تیروں سے اس جانباز کے پرخچے اُڑا دیے گئے۔ رشید آخری دم تک پورے جوش و خروش سے لڑتا رہا۔ اس کے ہاتھ کسی دشمن کی تلوار آ چکی تھی جس نے متعدد دشمنوں کی تواضع کی۔ آخر ہمارا مجاہد بھی جنّت کو سدھارا۔ مجمع حد سے زیادہ مشتعل ہو چکا تھا اور ہر طرف سے آوازیں آ رہی تھیں کہ باقی مسلمانوں کو زندہ جلا دیا جائے اور ابھی جلایا جائے وغیرہ وغیرہ۔ چند لوگ طارق، خالد اور نسیم کو مارتے پیٹتے کھینچتے ہوئے چبوترے کے سامنے لائے۔ دیکھتے ہی دیکھتے لکڑیوں کے انبار جمع ہو گئے۔ مشعلوں کی روشنی میں لوگ پہاڑ سے سوکھی جھاڑیاں اور لکڑی لانے لگے۔ جوشِ انتقام میں وہ اندھے ہو چکے تھے۔ انھیں اپنے لیڈر کی موت کا بہت رنج تھا۔ مگر بے گناہ مسلمانوں پر توڑے ہوئے مظالم یاد ہی نہ تھے۔ وہ نعرے لگاتے ہوئے چیختے چلّاتے چتائیں بنانے لگے۔ انھوں نے چار چتائیں تیار کیں۔ ایک مہاراج کے لئے اور تین ہمارے مجاہدوں کے واسطے۔ جب یہ کام ہو چکا تو ان تینوں شیروں کو چتاؤں پہ زندہ لٹا کر رسّوں سے باندھ دیا گیا۔ اس کے بعد ایک بہت بڑا ہجوم مشعلیں ہاتھ میں لئے رقص کرنے لگا کر ایکدم

ایک توپ سی چلی اور دیوی اوندھے منہ زمین پر گر پڑی ۔ پھر جیسے گولیوں کی بارش شروع ہو گئی ۔ اب مشین گنیں ہچکیاں لے رہی تھیں، بم کھانس رہے تھے اور لوگ ایک دوسرے پر گر کر جان توڑ رہے تھے ۔ کئی خود اپنی ہی مشعلوں سے جل مرے ۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا ۔ لاشوں کی سڑاند چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی ۔ روتے اور چلاتے ہوئے زخمی یہاں وہاں تلملا رہے تھے ۔ بھڑکے ہوئے گھوڑے اور خچر زخمیوں کو روند روند کر ہلاک کر رہے تھے ۔ سورماؤں کی جان پر بن آئی ۔ ہر طرف شور اٹھنے لگا بچاؤ بچاؤ ۔ کوئی گھنٹہ بھر یہ قیامت خیز کھیل جاری رہا ۔ آخرکار چاروں طرف خاموشی چھا گئی ۔ چند لوگ جو سکھ معلوم ہوتے تھے چتاؤں کی طرف جو جوں کی توں آگ سے محفوظ تھیں بڑھتے ہوئے نظر آئے ۔ ایک نے آہستہ سے پوچھا طارق تم کہاں ہو ۔ ایک چتا سے آواز آئی بھئی یہاں ہوں ۔ ایک شخص آگے بڑھا اور اس نے طارق کی رسیاں کھول کر اُسے آزاد کیا ۔ پھر خالد اور نسیم کو اُٹھایا گیا ۔ یہ تینوں حیرانی سے اپنے محسن کی طرف دیکھنے لگے ۔ تھوڑی تھوڑی خشک لکڑیاں مشعلوں کے گرنے سے روشن ہو رہی تھیں اس لئے فضا زیادہ تاریک نہیں تھی ۔ ایک دوست نے بھانپ لیا کہ طارق تذبذب کی حالت میں ہمیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے ۔ اس نے از خود کہا :-

بھئی میں ہوں سجن سنگھ تمہارا سنتری ۔ تم میری ہی حراست میں یہاں تک آئے ہو ۔ ابھی بھول گئے ۔ میں نے راستے میں کہا نہیں تھا کہ اگر ہو سکا تو تمہیں بچانے کی کوشش کروں گا ورنہ مجھے اس ظلم میں شریک نہ سمجھنا ۔

طارق۔ مگر تم تو آخری دم تک ہمارے ساتھ تھے۔ یہ سب کچھ یکایک کس طرح ہوا؟

سجن۔ اب یہاں سے نکل چلو۔ یہ تفصیل تو پھر سنائی جا سکتی ہے۔

طارق۔ چلو جناب، مردہ بدست زندہ۔

سجن۔ افسوس ہے کہ ہم رشید کو نہیں بچا سکے۔

طارق۔ (چونک کر) ارے تمہیں اس کا نام کیوں کر معلوم ہوا۔ ہم نے تو اس بات کی پوری احتیاط مدنظر رکھی تھی کہ دورانِ سفر میں کسی کا نام لے کر مخاطب نہ کیا جائے اور جب تک ابلیسی قافلے کے ساتھ ساتھ قیدی بنے پھرتے رہے کسی کا نام زبان سے نہیں نکلا۔ تمہیں کس طرح علم ہوا کہ ہمارا شہید ہونے والا ساتھی رشید تھا۔

سجن۔ مجھے علم نجوم میں بھی دلچسپی ہے اور بہت کچھ بتا سکتا ہوں۔ ذرا گھر پہنچ جائیں تو خوب باتیں ہوں گی۔

طارق۔ اچھا بھئی تمہاری مرضی، جہاں جی چاہتا ہے لے چلو۔

خالد۔ کہاں ہے گھر تمہارا؟

سجن۔ پندرہ سولہ میل کے فاصلے پر دریائے ستلج کے کنارے۔

طارق۔ بھئی پریم نگر بھی تو اسی دریا کے کنارے آباد ہے۔

سجن۔ سیدو والی، پریم نگر وغیرہ اسی کے ساتھ ساتھ آباد ہیں۔ بس اب چپ چاپ چلتے رہو۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی بدخواہ ان پہاڑی جنگلوں میں چھپ کر بیٹھا ہو۔ جب یہ پہاڑی علاقہ ختم ہو جائے گا تو اطمینان سے

باتیں کریں گے۔

طارق۔ یہ ایک گھوڑا فالتو کیوں ہے؟

سجن۔ بھائی' رشید کا بھی تو انتظام کرنا تھا۔ یہ اسی کے لئے منگوایا تھا۔ افسوس ہمارے یہ مددگار اس وقت پہنچے جبکہ اس کی لاش کے ٹکڑے ہو چکے تھے۔ اگر پندرہ منٹ اور دیر سے آتے تو تمہیں بھی ظالموں نے زندہ جلا دیا ہوتا۔

یہ سن کر طارق خاموش ہو گیا۔ اُسے رشید کی موت کا بے حد قلق تھا۔ اس لئے چہرے سے حزن و ملال کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ اب فضا میں صرف گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دیتی تھی یا دور جنگل میں کبھی کسی درندے کے گرجنے کی آواز اور بس۔

(۲)

گھوڑے پہاڑی راستہ طے کرتے رہے۔ کبھی راستے میں کوئی ندی حائل ہوتی' کبھی کوئی خشک نالہ۔ ایک معقول مدت کے بعد جب یہ پہاڑی سلسلہ ختم ہوا اور ان لوگوں نے ایک میدان میں قدم رکھا تو خالد نے طویل خاموشی سے اکتا کر سجن سے پوچھنا شروع کیا:۔

خالد۔ بھئی سجن ہمیں سفر کرتے ہوئے تقریباً دو گھنٹے گذر چکے ہیں اور اتنے عرصہ میں ایک آدمی پیدل آٹھ میل سفر طے کر لیتا ہے۔ ہم لوگ تو پھر گھوڑوں پر ہیں؟

سجن ۔ سمجھا کہ اکتا گئے ہو ۔ بس اب منزل قریب ہی ہے ۔ راستہ پہاڑی ہونے کی وجہ سے ہم نے رفتار تیز نہیں کی ۔ خیر اب تو قریب آ چکے ہیں ۔ ویسے بھی ہمیں طلوع آفتاب سے پہلے پہنچ جانا چاہیئے ۔ کیوں گلاب تمہاری کیا رائے ہے؟

اس نے ایک ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ۔

گلاب ۔ جوان ڈر کس بات کا ہے ۔ دن ہو یا رات چوروں یا ڈاکوؤں میں یہ جرأت کہاں کہ گلاب کے ڈیرے تک پہنچیں ۔ یہ سیاسی لیڈر بھی مجھ سے لرزتے ہیں جنھوں نے اپنا اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لئے دھرتی کو نرکھ بنا رکھا ہے ۔

طارق ۔ گلاب کی باتوں سے صداقت کی بُو آتی ہے ۔

گلاب ۔ سچائی ہمارا شیوہ ہے اور بنی نوع انسان کی خدمت ہمارا فرض ، لو منزل پر آ پہنچے ۔ بھگوان کا شکر ادا کرو ۔

ابھی صبح کاذب کا وقت تھا کہ یہ لوگ گلاب کے باغ میں داخل ہوئے ۔ وہاں دو تین سو نوجوان مسلح انتظار میں تھے ۔ یہ لوگ زیادہ تر سکھ ہی تھے لیکن گلاب نے بتایا کہ بعض مسلمان بھی ہیں جو اس کے مزارعہ ہونے کی وجہ سے وہیں آباد رہنے کا تہیہ کر چکے ہیں ۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ یہ لشکر محض مدافعت کے لئے منظم کیا گیا ہے کسی پر حملہ کرنے کے لئے نہیں ۔ گلاب سنگھ کے ملازموں نے بڑھ کر گھوڑے تھام لئے ۔ اور سب کے سب اُتر کر ایک حویلی کے صاف ستھرے دالان میں داخل ہو گئے ۔ صبح ہو چکی تھی اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چل رہے

تھے۔ گلاب بڑا عقلمند تھا اس نے مہمانوں کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے استراحت کا مشورہ دیا۔ لیکن طارق نے کہا کہ پہلے پانی منگوا دو تاکہ وضو کر کے نماز پڑھ لیں۔

سجن نے جواب دیا بھئی باہر دروازے کے ساتھ ہی کنواں چلنے لگا ہے۔ بلا تکلف وہیں چلے جاؤ۔ کوئی خطرہ نہیں۔ یہ مقام تمہارا اپنا مقام ہے کسی فتنہ پرداز کی جرأت نہیں کہ ادھر کا رُخ بھی کرے۔

گلاب۔ دوست ہمارا مذہب ست سنگ ہے۔ ہم سب کو مانتے ہیں۔

اس گفتگو سے مطمئن ہو کر طارق اور اس کے ساتھیوں نے وضو کیا، نماز پڑھی اور سو گئے۔ جاگے تو دوپہر ہو چکی تھی۔ انھیں بیدار دیکھ کر سجن بھی اندر آگیا اور طبیعت کا حال پوچھنے لگا۔ طارق نے جواب دیا:۔

طارق۔ پیارے سجن تمہاری دعا سے حال اچھا ہے۔ ذرا یہ بتاؤ کہ ہماری مدد کے لیے گلاب کس طرح پہنچا۔

سجن۔ گھوڑے پر چڑھ کر اور کس طرح۔

طارق۔ تم تو مذاق کرتے ہو بھئی۔ میرا تو یہ مطلب ہے کہ ——

سجن۔ (بات کاٹ کر) مطلب یہ ہے کہ میں نے اُسے بلایا تھا۔ لو اب تفصیل سن لو۔ جب وقت راہ چلتے ہوئے میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ اگر ہو سکا تو تمہاری مدد کروں گا۔ بس اسی لمحے میں نے اپنا ایک ساتھی گلاب کی طرف دوڑا دیا تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے سامری پور پہنچ کر تمہاری مدد کرے بلکہ یہ میری مدد تھی تم نہیں جانتے کہ اس میں کیا بھید ہے۔ گلاب اطلاع ملتے ہی ایک چھوٹی توپ، چار مشین گنیں اور گھوڑے لیے ہوئے ہماری طرف

روانہ ہوگیا اور علین اُس وقت پہنچا جبکہ وہ لوگ تمہیں زندہ جلانے کی تیاریاں کر چکے تھے۔ چونکہ پروگرام اُسے معلوم ہی تھا اس لیے مزید مشورے کے بغیر آناً فاناً اس نے کارروائی شروع کر دی جس سے ہوا کا رخ بدل گیا۔ میں تو گلاب کے جاسوس کی حیثیت سے قافلے کے ساتھ تھا۔ اور سردار رگھبیر سنگھ کی پارٹی نے جس کی قید میں تم اسیر تھے مجھے اتفاقیہ تمہارا چوکیدار بنا دیا۔ انہیں اُمید تھی کہ محبت رائے سے معقول رقم بٹوریں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اِدھر مجھے تم سے ہمدردی تھی، نہ جانے کیوں؟ میں اکیلا ہونے کی وجہ سے اُن کی مخالفت کرنے سے ڈرتا تھا۔ چلو اچھا ہوا وہ بھی سب کے سب ہلاک ہو چکے ہیں۔

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ گلاب کے ملازم کھانا لے کر آئے، سادہ ترکاری، روٹیاں اور لسی۔ سب نے سیر ہو کر کھایا۔ اس کے بعد جب ملازم برتن اُٹھا کر واپس چلے گئے تو سجن نے نسیم کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا:۔

سجن۔ بھئی میرا علم نجوم یہ کہتا ہے کہ یہ شخص لڑکا نہیں۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ یہ لڑکی ہے۔ اسے آخر کب تک مردوں میں رکھا جا سکے گا۔ تم اسے بلا خوف وخطر گلاب کی بہن کے پاس بھیج دو۔ وہ گاؤں میں رہتی ہے اور ہم لوگ مصلحتاً کوئی میل سوا میل کے فاصلے پر اس حویلی میں مقیم ہیں۔

طارق۔ مگر ——

سجن۔ (بات کاٹ کر) مگر اگر کچھ نہیں۔ تم خود ہی سوچو کہ نسیمہ آخر کب تک مردوں میں رہ سکتی ہے۔ ایک دو دن کی بات ہو تو اور بات ہے لیکن تمہیں

تو یہاں مہینہ دو مہینہ ٹھہرنا پڑے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے زیادہ دیر رہنا پڑے۔ ان حالات میں اسے بہت تکلیف ہو گی، اُٹھنے بیٹھنے کی تکلیف نہانے دھونے کی تکلیف اور وہاں گھر میں عیش سے رہے گی۔

اسی اثنا میں گلاب بھی آگیا اور کہنے لگا:۔

گلاب۔ نجومی ٹھیک کہتا ہے۔ بس ایسی ہی میری دو چھوٹی بہنیں پہلے موجود ہیں اور واہگورو کی قسم یہ تیسری بہن ہے۔ بھائی کا خاندان قتل ہو جائے لیکن بہن پر آنچ نہ آئے گی۔ میں اسے اپنی آبرو سمجھتا ہوں۔ طارق گھر بھجوا دو۔

آخر غور و فکر اور خالد سے مشورہ کر لینے کے بعد طارق نے نسیمہ کو گاؤں بھجوا دیا اور خود حیرانی سے سوچنے لگا کہ سجن نے یہ علم کیسا سیکھا ہے۔ اگر کبھی کوئی بات اس سے چھپانی پڑی تو بڑی مشکل پیش آئے گی۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سجن بولا:۔

سجن۔ بھائی خالد تم اطمینان رکھو نسیمہ صرف تمہاری ہی بہن نہیں ہماری بھی بہن ہے۔

طارق۔ بھئی کمال ہو تم۔ ہر ایک کا نام جانتے ہو، رشتے جانتے ہو۔ آخر کون ہو۔ کیا بلا ہو۔

سجن۔ میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ وقت پر بتا دوں گا۔ سرِدست اتنا کہتا ہوں کہ سجن اور گلاب پر اسی طرح بھروسہ کرو جس طرح تمہیں اپنی ذات پر اعتماد ہے۔ نماز ظہر کا وقت گذر رہا ہے۔ ذرا اُٹھو یہ فریضہ بھی ادا کر لو۔

باتیں تو ہوا ہی کریں گی۔

طارق اور خالد حیران و ششدر رہے اُٹھے اور نماز میں مشغول ہو گئے۔ جب فارغ ہوئے تو درختوں کی گھنی چھاؤں میں چارپائیاں بچھا کر لیٹ رہے۔ سجن کہیں سے سگرٹوں کا ایک ڈبہ اُٹھا لایا اور کہنے لگا۔

سجن۔ لو بھئی انجن بھی چلاؤ۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ تم تمباکو بھی پیتے ہو۔

طارق۔ مگر یہ تو سکھوں کی جگہ ہے۔

سجن۔ بہت تنگ دلوں کی، سچے ساتھ والوں کی۔ تم جو چاہو کھاؤ پیو ہمارے منہ میں تھوڑی آ جائے گا۔ اس کے علاوہ بیاس سے اِدھر کے اکثر سکھ حقہ تمباکو پی لیا کرتے ہیں۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ راستے میں تمہارے ساتھ ایک اور بھی لڑکی تھی۔ کیا نام تھا اس کا۔ یہی سعیدہ، ہاں سعیدہ۔ اب کہاں گئی وہ؟

اس کے اس سوال پر طارق نے خالد کی طرف دیکھا اور تعجب کا اظہار کیا۔

طارق۔ جب تم اتنا کچھ جانتے ہو تو یہ بھی بتاؤ کہ وہ کہاں گئی کیا ہوئی؟

سجن۔ میں تو بتا ہی دوں گا۔

خالد۔ مزا تو جب ہے کہ ابھی بتاؤ۔

سجن۔ گلاب کی بہن کے پاس۔ اس وقت نسیمہ سے مل چکی ہو گی۔

طارق۔ بھئی یہ کیا معمہ ہے؟

خالد۔ قدرت نے ہمیں پھر ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔

سجن - خدا کی مہربانی سمجھو۔

طارق - بھئی اس سے ملنا چاہیئے، نہ جانے کیا گذری ہوگی بے چاری پر۔

سجن - غنیمت سمجھو کہ بچ گئی۔

طارق - کچھ مفصل بتاؤ۔

سجن - بال کی کھال نہ اُتارا کرو۔ جو بیت گئی سو بیت گئی۔ آج شام کھانا وہیں چل کر کھائیں گے۔ گلاب کے پتا چودھری سردار سنگھ سے بھی مل لینا۔ بے نظیر انسان ہیں۔ آج رات کھانے پر اُنھوں نے بلایا ہے۔ سعیدہ بھی وہیں ہوگی۔ گلاب نے سعیدہ اور نسیمہ کی ملاقات کا نقشہ کھینچتے ہوئے بتایا تھا کہ دونوں گلے مل کر پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ وہ کہتا تھا کہ میں اس وقت گھر سے باہر نکل آیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میری بھی چیخ نہ نکل جائے۔ بڑا دردناک منظر تھا۔

سجن کہے جا رہا تھا اور خالد اور طارق خاموشانہ سن رہے تھے۔ وہ تصور میں سعیدہ کو مختلف بھیانک مصائب میں گزرتا دیکھ رہے تھے۔ خالد تو عجیب روحانی کشمکش میں مبتلا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ آخر سجن خاموش ہوگیا اور ماحول پر اُداسی چھاگئی۔

شام کے وقت یہ لوگ چودھری سردار سنگھ کی طرف چلے گئے۔ وہاں دعوت کا اہتمام تھا۔ سعیدہ اور نسیمہ کی ملاقات تو ہو ہی چکی تھی اور وہ اپنی اپنی داستانِ الم ایک دوسرے کو سنا چکی تھیں۔ لہٰذا اب یہ کہانیاں دُہرانے کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ سعیدہ کی آپ بیتی تو تھی ہی ایسی کہ اُسے فراموش کرنا ہی بہتر تھا۔ وہ بدنصیب تو اس حادثے کے تصور ہی سے لرز جاتی تھی۔ جب اس نے سنا کہ خالد گھر کی چار دیواری

میں داخل ہو گیا ہے تو اس کا جی چاہا کہ کہیں دور بھاگ جائے۔ وہ دل میں کہہ رہی تھی اے زمین خدا کے لئے پھٹ جا اور مجھ بد نصیب کو چھپا لے۔ آہ میں اُسے کس طرح منہ دکھا سکتی ہوں۔ اس خیال کے زیرِ اثر وہ دوڑی اور مکان کے عقبی دروازے سے باہر نکل گئی۔ ادھر خالد تھا کہ اُسے چاروں طرف ڈھونڈھ رہا تھا۔ وہ چودھری مردار سنگھ سے چند رسمی باتیں کر کے اُٹھا اور سعیدہ کو تلاش کرنے لگا۔ پریمو جو متعارف ہو چکی تھی ساتھ ساتھ حویلی کے کونے کونے میں دیکھنے لگی۔ جب کہیں نہ ملی تو اس نے گورستان کی راہ لی۔ خالد بھی افسردہ خاطر ہو کر ہمراہ ہو لیا۔ قبرستان میں داخل ہوتے ہی چاند کی پھیکی سی روشنی میں ایک لڑکی سید صاحب کی قبر پر فاتحہ پڑھتی ہوئی نظر آئی۔ پریمو نے خالد سے کہا:۔

پریمو۔ خالد بھیا وہ ہے آپ کی سعیدہ، بس جایئے میں یہیں ٹھہرتی ہوں۔

یہ سنتے ہی خالد اس کی طرف بڑھا اور پریم کو مصلحتاً وہیں ٹھہری رہی۔ سوکھی گھاس اور پتوں کی چرچراہٹ نے جاسوسی کی۔ سعیدہ نے خالد کے پاؤں کی چاپ سن لی۔ وہ خوف زدہ ہرنی کی طرح زقند لگا کر دوڑی اور کچھ فاصلے پر ایک پُرانی پھٹی ہوئی قبر میں چھپنے لگی مگر خالد نے لپک کر فوراً پکڑ لیا۔ کھینچا تو غش کھا کر گر پڑی۔ خالد نے بیٹھ کر اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد ہوش میں آئی تو اس کے رخسار خالد کے آنسوؤں سے بھیگ چکے تھے۔ سعیدہ نے دبی زبان میں کہا:۔

سعیدہ۔ یہ کیا؟

خالد۔ گلاب کے پھولوں پر شبنم۔

سعیدہ - (اُٹھ کر) آپ رو رہے ہیں۔ ہاں میری قسمت پر رونا ہی چاہیئے۔
خالد - کیا اس لئے کہ تم خدا کی راہ میں سب کچھ لٹا چکی ہو؟
سعیدہ - ہاں لوٹی جا چکی ہوں۔
خالد - تو اس سے بڑی سعادت کیا ہے سعیدہ؟ خدا نے جس کو جتنا صاحب ایمان سمجھا اُس سے اتنا ہی کڑا امتحان لیا۔ باقی رہا میرا معاملہ تو مجھے اپنا غلام بے دام سمجھو۔
اس فقرہ کے ساتھ خالد پھر رونے لگا۔
سعیدہ - مگر آپ بار بار روتے کیوں ہیں؟
خالد - فرطِ مسرت میں روتا ہوں۔
سعیدہ - (تعجب سے) فرطِ مسرت میں؟
خالد - ہاں۔ میں تو تمہاری زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ آج تمہیں اپنی آنکھوں کے سامنے جلوہ فگن دیکھتا ہوں تو خوشی میں آنسو نکلتے ہیں۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

گریۂ فرقت کا کچھ ایسا نا تھا وکی
انبساطِ وصل سے آنکھوں میں آنسو آگئے (وکی وارثی)

سعیدہ - (رکتے ہوئے) میرا تو خیال تھا کہ آپ مجھے دھتکار دیں گے۔
خالد - اگر تمہاری خطا ہوتی تو ضرور ایسا ہی کرتا لیکن تم بے گناہ ہو۔ اسی طرح عفیفہ ہو جس طرح کہ پریم نگر میں تھیں۔ انصاف مظلوم کی حمایت کرتا ہے۔ اُسے سزا نہیں دیتا۔ اور اسلام سے بڑھ کر انصاف کا علم بردار ہے

کون؟ اگر کوئی شیطان راہ چلتا ہوا گلشن کی کیاریوں کو روند ڈالے تو معصوم کلیوں کا کیا گناہ! آہ تمہاری مجبوری و بے چارگی وہ بھی خدا کی راہ میں جسے تمام قدرتیں حاصل ہیں۔

سعیدہ۔ میں آپ کا احسان عمر بھر نہ بھولوں گی۔

خالد۔ گویا مجھے خدا کی خوشنودی سے محروم رکھنا چاہتی ہو۔ میں نے تو سب کچھ خدا کی رضا جوئی کے لئے قبول کیا ہے۔ (پھر گھبرا کر) نہیں بلکہ تمہیں تمہاری محبت کے لئے قبول کرتا ہوں۔

سعیدہ۔ (مسکرا کر) لگے بہکی بہکی باتیں کرنے۔

خالد۔ شراب حسن نے بے خود سا کر دیا ہے نشہ سا محسوس کرتا ہوں۔

ایک آواز۔ زیادہ کیوں پی رہے ہو بس چھوڑ بھی دو۔

اس آواز سے چونک کر دونوں نے جو دیکھا تو نسیمہ پریمو کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی تھی۔

خالد۔ بڑی بے باک ہو گئی ہو تم، مانا کہ تم مجھ سے بہت چھوٹی نہیں ہو پھر بھی ——

نسیمہ۔ (بات کاٹ کر) بھائی میں نے تو بھابی سے مذاق کیا ہے۔

سعیدہ۔ شریر لڑکی تو آئی کیوں یہاں پر؟

پریمو۔ میں نے ہر چند روکا لیکن اس نے پروا نہ کی۔ اچھا اٹھو اب گھر چلو کھانے کے لئے انتظار ہو رہا ہو گا۔ دیر کافی ہو گئی ہے۔

خالد۔ ہاں ٹھیک ہے۔ چودھری انتظار کرتے ہوں گے۔

اس کے بعد سب کے سب گھر چلے گئے۔ وہاں طارق، گلاب، سجن اور

چودھری منتظر تھے۔ چودھری نے حسب عادت اپنے عقائد پر روشنی ڈالی، فسادات کی مذمت کی بلکہ یہ بھی کہا کہ اگر منہا قائداعظم کی دعوتِ تعاون قبول کر لیتے تو فائدے میں رہتے۔ مغربی پنجاب سے دیس نکالا نہ تھا۔ کروڑوں کی جائداد سے محروم نہ ہوتے۔ پھر یہ بھی کہ فیروزپور اور اس کے نواحی علاقے میں آزاد سکھ ریاست بھی ہوتی جس کے لئے آج ہندو حکومت کے آگے فریاد کرنی پڑتی ہے۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔

طارق۔ (سجن کی طرف اشارہ کر کے) ذرا ان نجومی صاحب سے پوچھیئے کہ اونٹ اب کس کروٹ بیٹھے گا۔

خالد۔ سب سے پہلے نجومی صاحب کی اپنی ذاتِ شریف کے متعلق ہی دریافت کر لو۔

چودھری۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ابھی تک آپ کو اندھیرے ہی میں رکھا ہے۔ کیوں سجن؟

سجن۔ آنکھ مچولی اور وہ بھی اگر اندھیرے میں کھیلی جائے تو خوب لطف رہتا ہے۔

طارق۔ بھئی ہم نے ہار مان لی۔

گلاب۔ لو میاں میں تمہارے اضطراب دور کئے دیتا ہوں۔ یہ ہے تمہارا پُرانا دوست حمید۔ اسے پریم نگر سے کچھ دور تمہاری پارٹی سے چھین لیا گیا تھا۔ تفصیل سجن ہی کی زبانی سنو۔

سجن۔ اچھا تو سنو بھائی۔ سب سے پہلے یہ بتا دوں کہ گلاب میرا پُرانا دوست ہے

اور تم لوگ عمر میں ہم سے تو نو دس دس برس چھوٹے ہو گویا ہمارے بچے ہو۔

طارق۔ بیشک چھوٹے بھائی بہن بچوں ہی کے برابر ہوتے ہیں۔

سجن۔ گلاب اور میں ابھی نو عمر ہی تھے کہ ہم نے دہشت پسندوں کی تحریک میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ۱۹۳۰ء کا زمانہ تھا۔ اس وقت زمانے کی ہوا ہی کچھ اور تھی۔ ہم پر متعدد بم کیس بنائے گئے، جیلوں میں ٹھونسا گیا۔ ہم بارہا برف کی سلوں پر لٹائے گئے۔ نجاست سے بھرے ہوئے تو بروں کو ہمارے منہ سے باندھا گیا تاکہ مجبور ہو کر پولیس کو کوئی نہ کوئی راز بتا دیں۔ غرضیکہ بُری طرح دق کیا جاتا رہا۔ اب اس کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔ ان زیادتیوں سے تنگ آ جانے کے بعد ہم دونوں روس بھاگ گئے۔ پھر ترکی اور جرمنی میں رہے۔ کمال پاشا سے ملے۔ عبید اللہ سندھی سے ملاقات کی۔ آخر ۱۹۴۵ء میں وطن آنا پڑا۔ جب یہاں آکر دیکھا تو یہاں کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ ان حالات سے طبیعت اس قدر مایوس ہوئی کہ ہم سیاسیات سے کنارہ کشی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ شروع میں مجھے حضرت قائد اعظم کے پروگرام اور خیالات سے اختلاف تھا مگر جب حقیقت سامنے آئی تو یہ ماننا پڑا کہ اقبال اور جناح جیسے لوگ بڑے صاحب فراست تھے اور ان کے اندیشے وہم نہیں تھے۔ اب صاف ظاہر ہو گیا کہ ہندوستانی قومیت کا ڈھونگ ایک خطرناک حربہ ہے جس سے ملت اسلامیہ کو ختم کر دینا مقصود ہے اور کچھ نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ بلا امتیاز ہر مسلمان کو مٹانے کی کوشش کی گئی، کانگریسی غیر کانگریسی، پاکستانی غیر پاکستانی، غرضیکہ ہر ایک کے لیے

تیغِ ستم چلائی گئی کسی کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ ڈاکٹر کچلو جیسے وطن پرست بھی امرتسر سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ ابھی ——

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

ہاں تو جس روز ہم مسلم آباد سے روانہ ہو کر اس مقام تک آئے جہاں ہمارے قافلے کے پہلے دستوں کو تہِ تیغ کیا جا چکا تھا اور ہم زخمیوں کی دیکھ بھال کے خیال سے گاڑی سے اُترے تھے تو بس اسی گڑبڑ میں اُسی لمحے مجھے آپ سے جدا کر دیا گیا۔ تین چار شخص یکبارگی میری طرف بڑھے اور مجھے اغوا کر کے لے گئے۔ اس وقت تم سب کے سب فائرنگ میں مصروف تھے اور رضیہ میری بیوی ہلاک ہو چکی تھی۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ میرا بھائی لطیف بھی زخمی ہوا تھا۔

طارق - پہلی گولی اُنھیں کے لگی تھی۔ دوسری آپا رضیہ کے۔ میں نے اُن سے کہا بھی کہ گاڑی سے نہ اُتریں لیکن وہ جوش میں تھیں۔ میدان میں اُتر ہی گئیں۔

محسن - خدا کی مرضی، ہاں تو میں نے دور سے دیکھا کہ لطیف کے گولی لگی ہے اور وہ کھیتوں میں گر پڑا ہے۔ اتنے میں چند لوگ مجھ پر غالب آگئے اور مجھے باندھ کر لے چل دیئے۔ اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ الٰہی میں کوئی عورت نہیں اور نہ کوئی خوبصورت دوشیزہ ہوں۔ آخر مجھے اغوا کیوں کیا جا رہا ہے۔ سوچنے کے باوجود بھی جواب نہیں سوجھتا تھا۔ کچھ فاصلے پر جا کر ان لوگوں نے مجھے کھول دیا اور آزادانہ چلنے کو کہا۔ البتہ میری آنکھوں پر پٹی بدستور رہنے دی۔ مختصر یہ کہ کوئی دو ڈیڑھ گھنٹے کے بعد

میں ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں قید تھا اور پورے چوبیس گھنٹے اس قید تنہائی میں پڑا رہا۔ اس کے بعد چند لوگ آئے اور مجھے ایک ایسے مقام پر لے گئے کہ جہاں دو تین سو کے قریب دشمن جمع تھے۔ ایک بڑا سا شخص صدارت کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اُس نے میری طرف مخاطب ہو کر کہنا شروع کیا:۔

وہ - میاں تمہاری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے جوان تمہیں زندہ لے آئے۔ اگر تمہیں وہیں قتل کر دیتے تو کون پوچھنے والا تھا۔

ایک اور - (اپنے لیڈر سے) جناب یہ تو پُرانے قوم پرست ہیں۔ ہم انھیں پہچانتے تھے جبھی بچا کر لائے ہیں۔

ایک اور - مہاراج یہ کٹر کانگرسی ہیں۔ آپ جو حکم دیں گے بجا لائیں گے۔

وہ - ان کا بھلا بھی تو اسی میں ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا میاں؟

میں - آپ فرمائیں تو سہی۔ آخر آپ کیا چاہتے ہیں۔

وہ - کامریڈ یہ لوگ جو پاکستان کی خاطر جان گنوا رہے ہیں پرلے درجے کے فرقہ پرست ہیں۔ ان لوگوں میں مطلب کے آدمی نہیں ملتے۔ اس لئے تمہیں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ تم دلی چلے جاؤ۔ اور وہاں کے مسلمانوں کو بھارت کے خلاف اتنا بھڑکاؤ کہ وہ متنفر ہو کر پاکستان چلے جائیں۔

میں - وہ تو خود ہی جا رہے ہیں۔ پھر میرے بہکانے کی کیا ضرورت ہے؟

وہ - ہم چاہتے ہیں کہ جو نہیں جا رہے وہ بھی چلے جائیں۔ یہ سب فرقہ پرست ہیں تم نہیں جانتے۔

میں - تو پھر قوم پرست کون ہے؟

وہ - آزاد جی ہیں، قدوائی ہیں اور تمہاری طرح کے کامریڈ بھی -
میں یہ سن کر مسکرایا اور انھیں کچھ برا محسوس ہوا -
میں - دیکھو صاحب مجھ سے یہ غداری نہیں ہو سکتی -
وہ - غداری کیسی - تم نے جس کام کے لئے تمام عمر جیلوں میں گزاری، جلاوطن بھی ہوئے، بس اسی کام کی تکمیل کے لئے تم سے کہا جا رہا ہے - اگر دولت کی ضرورت ہے تو اس کے انبار قدموں میں لگائے جا سکتے ہیں -
میں - مجھے دولت کی ضرورت نہیں، شکریہ - اور نہ ہی ہندو مسلمانوں میں نفرت پھیلانا میرا کام ہے - میں تو دونوں کو بھائی بھائی سمجھتا ہوں -
وہ - تم بھولتے ہو - اب وہ زمانہ نہیں -
میں - (غصے میں) موجودہ زمانہ تم جیسے قومی ظالموں کا لایا ہوا ہے -
وہ - (بگڑ کر) بکو نہیں، ورنہ اس طرح ماروں گا کہ خود موت بھی لرز جائے گی -
میں - مجھے پرواہ نہیں -
وہ - (جوش میں) کوئی ہے ؟
ایک - (ہاتھ باندھ کر) حضور !
وہ - بس لے جاؤ - سمجھے ؟
ایک - ہاں، شریمان -

اس کے بعد چار دیو قامت نوجوانوں نے مجھے جکڑ لیا اور ایک ایسی حویلی میں لے گئے جہاں عجیب ہنگامہ تھا - پندرہ بیس جوان شراب پی رہے تھے اور کوئی پندرہ بیس لڑکیاں مادر زاد برہنہ رقص کر رہی تھیں - ان کی حرکات سے

معلوم ہوتا تھا کہ وہ رقص سے قطعاً ناواقف ہیں۔ انھیں جبراً شراب پلائی جارہی تھی اور انکار کی صورت میں بید سے پیٹا جاتا تھا۔ وہ مسکرانے اور ناز و ادا سے دل لبھانے کے لئے مجبور کی جارہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اور لبوں پر جھوٹی مسکراہٹ تھی۔ مجھے ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک کونے میں بٹھا دیا گیا۔ اتنے میں ایک لڑکی جو نہایت خوبصورت تھی ساقیہ بنادی گئی۔ اس کے ہاتھوں میں جام اور صراحی دے کر رقص کا حکم دیا گیا۔ غریب جھجکی، شرمائی اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے صراحی گر کر چور چور ہوگئی۔ بس پھر کیا تھا ان شرابی وحشیوں کو جنون سا ہوگیا۔ ایک بدمعاش غصّہ میں اٹھا اور اس نے بلا سوچے سمجھے اس قدر ہنٹر لگائے کہ بے چاری اگلے جہان سدھار گئی۔ وہ بے ہوش ہو کر گری تو قہقہے بلند ہوئے۔ ایک سودائی نے چلا کر کہا کہ یہ بے ہوشی ایک ہلتر ہے۔ ہٹو میں ٹھیک کرتا ہوں۔ ان الفاظ کے ساتھ وہ بدبخت جسے خود اپنا ہوش نہیں تھا اس برہنہ لاش کے ساتھ چمٹ گیا۔ اس کو دیکھ کر دوسرے شیطان بھی ایک ایک معصوم پر ٹوٹ پڑے۔ جب اس خوفناک ٹریجڈی کا انٹرول ہوا تو اکثر لڑکیاں ہلاک ہوچکی تھیں اور جو بچ گئیں ان میں سے کسی کے رخسار زخمی تھے اور کسی کے پستان۔ اور کسی کی ناک دانتوں سے چبا ڈالی گئی تھی۔ انٹرول کے بعد جب پھر ٹریجڈی شروع ہوئی تو ان سسکتی ہوئی لاشوں کو نذرِ آتش کردیا گیا۔ یہ تھا اختتام اس المیہ کا جو میری بدنصیب آنکھوں نے دیکھا۔ مجھے احساسِ بے لسبی نے نڈھال کردیا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں بندھے تھے، منہ میں رومال ٹھونسا ہوا تھا۔ نہ تو ہلنے کی ہمت تھی اور نہ چیخنے کی طاقت۔ میں تاریخ کا طالب علم رہا ہوں۔ میں نے تصور ہی تصور

میں تاریخِ عالم کے تمام اوراق الٹ کر دیکھے لیکن اس بربریت اور وحشت کی کہیں مثال نہ ملی۔ پھر تاریخِ اسلام پر نظر دوڑائی۔ وہاں ملا تو یہ ملا کہ غلاموں سے برادرانہ سلوک کیے گئے۔ مفتوحہ عورتوں کو عزت کے ساتھ حرم میں داخل کیا گیا۔ دشمنوں کو امان دی گئی جو جہاں بانوں اور حکمرانوں کے طریقے ہیں۔ ان بے چاروں کو کیا خبر کہ حکومت کس طرح کی جاتی ہے۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے:۔

یہ غلام ابنِ غلام ابنِ غلام ابنِ غلام
سود سرمایہ تعصب ہی رہا جن کا امام
خاک سمجھیں گے ہے کیا فلسفۂ طرزِ نظام
مسندِ حکم و عدالت سے اٹھا دو ان کو
جو فروشی کی دکانوں پہ بٹھا دو ان کو (روحی دارثی)

تمام رات میں جوں کا توں وہیں پڑا رہا۔ فرش پر بکھری ہوئی شراب کی بو جا بجا پھیلے ہوئے خون کے داغ، سڑے ہوئے اعضا، جھلسے ہوئے ادھوئے جسم، کہیں کوئی کٹا ہوا پستان، کہیں کوئی کٹی ہوئی ناک اور کسی کونے میں بڑبڑاتے ہوئے شرابی جو عالم بے ہوشی میں بھی وہی خرافات بک رہے تھے جس سے تعصب، حماقت اور بربریت کی بو آرہی تھی میرے ماحول کی رونق تھے۔ صبح سویرے ہی ایک شخص نے میرا شانہ ہلاتے ہوئے کہا:۔

وہ شخص۔ کامریڈ میں تمہارے ہاتھ پاؤں کھولتا ہوں۔

اور اس نے ایسا ہی کیا۔ پھر کہنے لگا:۔

وہ۔ کیوں اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالتے ہو؟

میں۔ میں مصیبتوں سے نہیں ڈرتا، خواہ مجھے مار ہی ڈالیں پرواہ نہیں۔
وہ۔ شاید تمہیں ہلاک نہ کریں لیکن ایسے ہولناک واقعات دکھانے سے گریز نہیں کریں گے۔ کیا تم برداشت کر سکو گے؟
میں۔ بھئی خدا کے واسطے ایسا نہ کرو۔ آخر تم بھی انسان ہو۔
وہ۔ میرے ساتھ آؤ۔
میں۔ کہاں؟
وہ۔ جہاں میں لے جاؤں۔ آج تم میرے اختیار میں ہو۔
میں چپ چاپ اس کے ساتھ چلا گیا۔ چند منٹ کے بعد میں ایک عالیشان مکان میں تھا۔
وہ۔ یہ میرا مکان ہے اور میرا محکمہ جبر و تشدد کے محکمے سے بالکل جدا ہے۔ میں بڑی مشکل سے تمہیں یہاں لا سکا ہوں۔ تمہاری گذشتہ زندگی میری نظروں میں ہے کامریڈ۔ تم یہاں بالکل محفوظ ہو۔ آج آرام کرو۔ میرے ملازم ہر آسائش مہیا کریں گے۔ کل میں آؤں گا تو مفصل باتیں ہوں گی۔ بہر دست یہ ضروری ہے کہ گذشتہ واقعات کا اثر تمہارے ذہن سے دور کیا جائے۔
میں نے ہر چند اصرار کیا کہ وہ میری نظر بندی کی غرض و غایت تو بتا دے لیکن بے سود۔ وہ خاموشی سے چلا گیا۔ ابھی میں اس معاملے پر غور کر ہی رہا تھا کہ ایک ملازم حاضر ہوا اور کہنے لگا صاحب غسل کر لیجیے پانی تیار ہے۔ جی تو نہیں چاہتا تھا لیکن خیال پیدا ہوا کہ شاید یہ ساعتیں زندگی کی آخری گھڑیاں ہوں اس لئے نہا لینا ہی بہتر ہے۔ یہ سوچ کر میں غسل خانے میں چلا گیا اور خوب نہایا۔

فارغ ہو کر نکلا تو ملازم میز پر کھانا لگا چکا تھا۔ میں نے دو روز سے روٹی نہیں کھائی تھی اس لئے خوب پیٹ بھر کر کھایا اور سو رہا۔ جب آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی۔ منہ ہاتھ دھویا کلی کی اور پھر کمرے میں آ بیٹھا۔ اتنے میں ایک نہایت خوبصورت عورت عقبی دروازے سے داخل ہوئی۔ اس کی مہک سے سارا ماحول چمن زار سا بن گیا۔ عطریات میں بسا ہوا لباس ہر طرف خوشبو پھیلا رہا تھا۔ وہ آتے ہی بلا تکلف میرے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی:۔

وہ۔ آپ کو میری موجودگی پر اعتراض تو نہیں؟

میں۔ جی نہیں۔ مجھے اعتراض کیا! میں تو خود مہمان ہوں اور جن کی تلاش میں آپ تشریف لائی ہیں وہ یہاں نہیں۔

وہ۔ (مسکرا کر) میں تو کامریڈ حمید کی تلاش میں آئی ہوں۔ وہ کہاں ہیں؟

میں۔ جی وہ تو میں ہی ہوں۔ معاف کیجئے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔

وہ۔ یہ تو پہلے ہی امید تھی۔ افسوس آپ اپنے پرانے ساتھیوں کو بھول گئے روس اور ترکی میں رہ کر بھی آپ فرقہ پرستی کے جال سے نہ نکلے۔

میں۔ (حیرانی سے) مگر آپ؟

وہ۔ میں ہوں شیلا، آپ کی کامریڈ۔ کسان تحریک میں مدتوں آپ کے ساتھ کام کیا ہے۔

میں۔ (پہچان کر) تم تو ابھی جوان ہو!

شیلا۔ اور کیا بوڑھی ہو جاؤں۔ آپ سے چار پانچ سال چھوٹی بھی ہوں۔

میں۔ تم نے مجھے فرقہ پرستی کا الزام کیوں دیا ہے۔ تم جن ملکوں کا ذکر کر رہی ہو

مثلاً ترکی، تو کیا وہ اپنی اقلیتوں پر اس طرح ظلم کرتے ہیں۔ وہاں مسلمان اکثریت میں ہیں مگر وہ مروت اور انصاف کے علمبردار ہیں۔ اگرچہ وہ وطنیت کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے قومی حکومت بنائے ہوئے ہیں تو بھی اپنی اقلیتوں کو نیست و نابود نہیں کرتے۔

شیلا۔ چونکہ آپ نے مجھے پہچاننے میں تجاہل کیا ہے اس لئے مجھے یہ جملہ کہنا پڑا۔ میں سمجھی کہ شاید فرقہ پرستی کے جذبات کا اثر ہو۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ملازم شراب اور گلاس لے آیا اور شیلا نے بلا تامل دو گلاس بھر لئے۔

میں۔ (حیرانی سے) یہ کیا؟

شیلا۔ (مسکرا کر) انگور کے پانی کی چند بوندیں۔

میں۔ میں تو نہیں پیوں گا یہ شراب۔

شیلا۔ یہ شراب نہیں وسکی ہے۔

میں۔ لیکن میں نے کبھی ——

شیلا۔ (بات کاٹ کر) یہ انہیں سنائیے کہ جن کے ساتھ آپ نے کبھی پی نہ ہو۔ میں پیوں گی اور پلاؤں گی۔ اتنی مدت کے بعد آپ ملے ہیں۔ یہ میں ہی تو تھی جس نے آپ کو یہاں بلوانے کے لئے کوشش کی۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ ایک پرانا ہمکلاس تعصب کے شکنجے میں پھنس کر جان دینے والا ہے۔ میں نے اپنے ہم خیالوں سے ذکر کیا اور وہ موقع پا کر آپ کو لے آئے۔ اب حضور ہمیں سے کترانے لگے۔

میں۔ لیکن میں نے ایک مدت سے چھوڑ رکھی ہے۔

شیلا۔ دیکھو کامریڈ میں نے ایک مدت تمہاری خدمت میں گزاری ہے۔ مجھے وہ دن یاد ہیں کہ جب تم مادرِ وطن کی قسمیں کھا کھا کر مجھ سے وفادار رہنے کا وعدہ کیا کرتے تھے۔ پھر بدیشی راج کے ظلم سے مجبور ہو کر وطن سے بھاگ نکلے۔ میں تمہارے انتظار میں زندگی کے دن گزارتی رہی۔

میں۔ مجھے واپس آئے ڈیڑھ سال کی مدت گذر چکی ہے۔ اتنے دنوں تم کہاں رہیں؟

شیلا۔ مجھے تمہاری واپسی کی خبر ہی نہیں تھی ورنہ اتنی مدت دور بیٹھی رہتی۔ یہ لو جام اُٹھاؤ۔

میں۔ شیلا خدا کے لئے۔

شیلا۔ کامریڈ، ڈارلنگ۔

اس جملے کے ساتھ وہ میرے پہلو میں آ بیٹھی اور جام جبراً میرے منہ میں اُنڈیل دیا۔ میں نے کچھ سوچا، غور کیا اور مصلحتاً پی لیا۔ وہ اظہارِ محبت کرتی رہی، میں ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ میں نے دکھاوے کے طور پر تین چار جام پیئے اور حقیقت میں جام اپنے منہ کی بجائے اپنے گریبان میں انڈیلتا رہا۔ بناوٹ کے طور پر میں نے اپنی آنکھوں میں نشہ بھی ظاہر کیا۔ شیلا نے سوچا کہ اب اس کے جذبات بیدار ہو چکے ہیں۔ یہ اندازہ لگانے کے بعد میرے گلے میں بازو ڈال کر اور میرے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ کر کہنے لگی۔

شیلا۔ ایک مدت سے تمہاری تمنا میں مرتی ہوں۔ کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں۔

اس زمانے میں تو تمہیں بھی میری چاہت تھی۔

میں۔ (بظاہر نشے میں) میں اب بھی تمہیں اسی طرح چاہتا ہوں۔ کہو میری جان بھی حاضر ہے۔

شیلا۔ کل سماج کے پردھان نے تمہیں کچھ حکم دیا تھا؟

میں۔ ہاں لیکن میں نے انکار کر دیا۔ میں مسلمانوں کو بھگانا پاپ سمجھتا ہوں، شیلا۔

شیلا۔ مسلمان فرقہ پرست ہیں، تم ایک قوم پرست ہو۔ کامریڈ تمہارے لئے بس دو ہی راستے ہیں ان میں سے ایک اختیار کرنا ہوگا۔

میں۔ کیا؟

شیلا۔ قوم کی خدمت کرو تمہیں میری رفاقت حاصل ہوگی اور دولت بھی ورنہ

میں۔ ورنہ موت کے لئے تیار ہو جاؤں اور میں اس کے لئے حاضر ہوں۔ بدبخت خوبصورت ساحرہ تو حسن کی دولت سے میرا ایمان خریدنا چاہتی ہے۔

میں جوش میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میز الٹ گئی۔ شراب کی بوتل اور گلاس گر کر چور چور ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی بغلی کمروں سے فائر گونجے۔ میں ایک جست لگا کر برآمدے میں آگیا اور رات کے اندھیرے میں بھاگ نکلا۔ چند لوگ چیختے چلاتے میرے تعاقب میں آئے۔ بندوقوں، پستولوں سے فائر کرتے، پکڑو پکڑو کا شور مچاتے ہوئے دوڑے۔ اندھیرے کی وجہ سے مجھے کچھ سوجھتا نہیں تھا کہ کدھر جا رہا ہوں۔ خدا کے توکل پر بھاگا جا رہا تھا۔ اچانک ایک گولی میرے بائیں بازو پر لگی مگر یہ سمندِ جوش پر تازیانے کا کام کر گئی۔ میں اور تیز ہو گیا۔ دوڑا خوب

دوڑا حتیٰ کہ میں نے محسوس کیا کہ میں کسی ندی یا دریا میں گر پڑا ہوں۔ اس پر بھی میرے اوسان خطا نہ ہوئے۔ میں پانی کے بہاؤ کو پہچانتے ہوئے تیرتا چلا گیا۔ آخر قدرت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ صبح ہوئی تو ایک لاش دریا کی سطح پر تیر رہی تھی۔

اسی گاؤں سید والی کے چند لوگ دریا کے کنارے ٹہل رہے تھے۔ انھوں نے لاش دیکھی اور گلاب کو اس کی طرف متوجہ کیا۔ یہ اس وقت دریا میں تیرنے کی مشق کر رہا تھا۔ یہ شیر کی طرح لپکا اور مجھے بروقت کھینچ کر خشکی پر لے آیا اور چند ضروری تدابیر عمل میں لانے کے بعد میری جان بچالی۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ میری جان بچانے کے لئے میرے جگری دوست ہی کو مقرر کیا۔ آج اسی کی ہمدردی اور جوانمردی کا نتیجہ ہے کہ ہم لوگ بحفاظت یہاں موجود ہیں۔ بولو کامریڈ گلاب سنگھ زندہ باد ——

سب نے سنا اور خوب ہنسے۔ جب قہقہوں کا شور ختم ہوا تو خالد نے سجن سے پوچھا:-

خالد۔ مگر آپ حمید سے سجن کی جون میں کب آئے؟

سجن۔ گلاب کو معلوم ہوا تھا کہ دشمن میری تلاش میں ہیں اس لئے مصلحتاً یہ بھیس اختیار کرنا پڑا۔ اسی بہروپ کی بدولت جناب کو بچایا گیا تھا ورنہ حضور بھی رشید کی طرح اس مٹی کے کھلونے کے قدموں پر دم توڑ چکے ہوتے۔ آہ بے چارہ رشید۔

رشید کا نام آتے ہی محفل میں خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد سردار شام سنگھ

پرتاپ اور اُن کے بچوں کی یاد میں آنسو بہائے گئے۔ چودھری سردار سنگھ نے انھیں نصیحت کی کہ گزشتہ المناک واقعات کو بار بار یاد نہیں کرنا چاہیئے۔ روح پژمردہ ہو جاتی ہے۔

اب رات زیادہ جا چکی تھی اس لئے یہ لوگ گلاب کی حویلی میں واپس نہ جا سکے اور وہیں آرام کے لئے لیٹ گئے، عورتیں زنانے میں جا کر سو رہیں۔

(۳)

صبح ہوئی تو گاؤں کے چند لوگ چودھری سردار سنگھ سے ملنے آئے۔ طارق سے بھی ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ چودھری نے فوراً ملاقات کا انتظام کیا اور اس بات کا بھی اطمینان کر لیا کہ ملاقاتیوں میں کوئی شرارتی تو نہیں۔ اطمینان ہو جانے پر طارق اور خالد کو باہر بلایا۔ ملنے والے مدبر اور شریف لوگ تھے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ کوئی لمحہ بھر سکوت رہا۔ آخر ایک ملاقاتی نے زبان کھولی:۔

ملاقاتی۔ (طارق سے) میاں جی ہماری حاضری کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے گاؤں میں جو یہاں سے قریب ہی ہے دو مسلمان لڑکیاں لوگوں سے برآمد کی گئی ہیں، لیکن کسی طور پاکستان جانے پر رضامند نہیں ہوتیں۔ ہر چند سمجھایا لیکن بے فائدہ اور ادھر شرم کے مارے ہمارے سر گریبانوں میں جھکے جاتے ہیں۔ جناب آخر ہم بھی شریف ہیں اور ہمارے بھی جوان لڑکیاں ہیں۔ ہماری یہ تمنا ہے کہ یہ بے چاریاں اپنے ماتا پتا کے پاس پہنچ جائیں۔ آپ انھیں سمجھائیں شاید آپ کی نصیحت کچھ اثر کرے۔

طارق۔ کہاں ہے آپ کا گاؤں؟ اور کہیں یہ کوئی ——

گلاب۔ (بات کاٹ کر) نہیں یہ کوئی سازش نہیں اطمینان رکھو۔

ملاقاتی۔ بس ساتھ ہی ہے ہمارا گاؤں۔ ان درختوں کی اوٹ میں، یہی میل ڈیڑھ میل کا فاصلہ ہوگا۔

طارق۔ (سجن اور گلاب سے) تو ابھی کیوں نہ چلیں!

سجن۔ کوئی ہرج نہیں۔ عورتوں میں سے بھی کسی کو ساتھ لے لو۔

خالد۔ نسیمہ کو ساتھ لے جاؤ۔ اُنھیں سمجھائے گی۔

آخر اس خیال کو عملی جامہ پہنا دیا گیا۔ نسیمہ کے ساتھ طارق اور خالد گلاب اور اس کے ساتھیوں کی حفاظت میں روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر وہ لڑکیاں بلائی گئیں۔ نسیمہ نے اُن سے پوچھا:۔

نسیمہ۔ بہنو، کیا تم پاکستان جاؤ گی؟

ایک لڑکی۔ نہیں۔

طارق۔ کیوں؟

دوسری لڑکی۔ پاکستان تو مسلمانوں کے لئے بنا ہے اور مسلمان وہ ہیں جنکے ایمان سلامت ہیں اور یہاں معاملہ دگرگوں ہے۔ ایمان کی دولت شیطان نے لوٹ لی۔ اب ہمارا پاکستان سے کیا کام!

خالد۔ کیا تمہیں ماں باپ، بھائی بہن کی یاد نہیں ستاتی؟

پہلی لڑکی۔ ہمیں بھگوڑوں کے بچ نکلنے کی امید نہیں۔ مٹ چکے ہوں گے۔ اگر زندہ ہوں بھی تو ایسے بے حیا والدین کے پاس جانے سے فائدہ جو

اپنی جان بچانے کے لیے ہمیں بھوتوں کے حوالے کر کے بھاگ گئے۔

طارق۔ یہ الزام ہے۔ تمہیں سوچ بچار سے کام لینا چاہیے۔ اگر تمہیں اس درجہ حیا کا پاس تھا تو ڈوب کیوں نہ مریں، خودکشی کی ہوتی۔ آج والدین پر زبان دراز کرنے کے لیے زندہ رہنا کیا ضروری تھا؟ وہ جذباتی لڑکیاں جو خواہ مخواہ بہانوں کی آڑ لے کر یہاں رہنا چاہتی ہیں سخت غلطی پر ہیں۔ جرم تو اس پر عائد کیا جاتا ہے جو ہوش و حواس کی موجودگی میں کسی غلطی کا مرتکب ہو اور جس کے اپنے حواس ہی مفقود ہوں اُسے موردِ الزام ٹھہرانا انصاف کا خون کرنا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ایک بھی باپ نے اپنی جوان لڑکی کو دانستہ یہاں نہیں چھوڑا ہوگا۔ کیا تم نے نہیں دیکھا تھا کہ بعض عورتیں فساد کے خوف سے اس قدر حواس باختہ ہوئیں کہ انھیں بہ وقتِ فرار اپنے گود کے بچے بھی یاد نہ رہے۔ اکثر مائیں شیر خوار بچوں کو گھروں ہی میں بھول گئیں اور بعض نے دودھ پیتے بچے نہ جانے کیا سمجھتے ہوئے جوہڑوں اور دریاؤں میں پھینک دیے۔ کیا ایسا نہیں ہوا؟

دوسری لڑکی۔ ہوا ہے بلکہ ایسے واقعات ہم نے خود دیکھے ہیں۔

طارق۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ ایسی حرکتیں انھوں نے جان بوجھ کر کی ہیں۔ نہیں حادثات کے خوف سے اُن کے اوسان خطا ہو گئے تھے اور قیامت کی سی نفسی نفسی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی جس کی وجہ سے انسان اپنی ذات کے سوا سب کچھ بھول گیا۔ بس اسی طرح والدین نادانستہ طور پر اپنی جوان لڑکیاں بھول گئے اور جنھیں اپنے حواس پر قابو رہا وہ یا تو

انھیں خود ہلاک ہو گئے یا ساتھ لے جانے میں کامیاب ہوئے۔ یاد رکھو ہنگامی واقعات قانون کی حیثیت نہیں رکھتے۔ لہٰذا ایسے الزامات بے بنیاد ہیں۔ ماں باپ کی غفلت کو بہانہ نہ بناؤ اور اپنے وطن چلی جاؤ۔ کیا ارادہ ہے، بولو۔

جواب میں ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ طارق اور دوسرے افراد نے نسیمہ کو لڑکیوں کے پاس چھوڑ دیا اور خود باہر میدان میں آ بیٹھے۔ نسیمہ نے اچھی طرح سمجھا بجھا کر انھیں پاکستان کے لئے تیار کر ہی لیا۔ تجویز یہ ہوئی کہ انھیں سردست سیدوالی میں لے جایا جائے اور جب طارق اینڈ کو کی روانگی کا بندوبست ہو جائے تو یہ بھی ہمراہ پاکستان چلی جائیں۔

دوپہر کے قریب یہ لوگ چودھری سردار سنگھ کی حویلی میں واپس چلے آئے اور ان لڑکیوں کو پریمو کی تحویل میں دے دیا گیا۔ جب اس مصروفیت سے فارغ ہوئے تو طارق، خالد اور محسن کے ساتھ گلاب سنگھ کی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا جہاں انھوں نے ہیڈ کوارٹر بنایا ہوا تھا۔

حوادث

(۱)

جب مہینہ ڈیڑھ مہینہ گزر گیا اور حالات قدرے پُر سکون نظر آئے تو طارق نے گلاب سے کہا کہ اب ہمیں رخصت کر دیا جائے۔ فسادات تھم گئے ہیں، فتنے امن کی آغوش میں سو رہے ہیں۔ جاگ اُٹھے تو پھر قیامت برپا ہو گی۔ اس وقت ہمارے نکل جانے کے لئے بہترین موقع ہے، وغیرہ وغیرہ۔ گلاب نے یہ گفتگو سنی تو خاموش ہو گیا۔ آخر طارق کے اصرار پر کہنے لگا:-

گلاب۔ تمہارا خیال صحیح ہے۔ گو فتنے بظاہر سوئے ہوئے ہیں لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ کبھی سنا نہیں کہ آندھی سے پہلے حبس سا ہوتا ہے۔ کیا تم یہاں سے نکل کر کسی اور مصیبت میں گرفتار ہونا چاہتے ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ پاکستان کی

کشش تمہیں کھینچ رہی ہے مگر سلامتی اسی میں ہے کہ ابھی کچھ روز اور یہاں ٹھہرو۔
ٹرین میں جانا بہت خطرناک ہے اور سڑک پر روانہ ہونا تو اس سے بھی
زیادہ۔ ہوائی جہاز تو یہاں سے چلتا ہی نہیں کہ تمہیں اس میں سوار کرا دیتا۔

طارق۔ بھئی جس خدا نے آج تک بچایا ہے وہ کل بھی حفاظت کرے گا۔ تم
ہمیں کچھ ہتھیار اور آدمی ساتھ دیدو جو ہمیں بیاس کے پار چھوڑ آئیں۔

گلاب۔ ہوش کی بات کرو۔ بیاس کے پار کیا پاکستان شروع ہو جاتا ہے
جہاں فوج سیاہ تمہارے استقبال کے لئے کھڑی ہو گی۔

طارق۔ تو پھر ریل کے ذریعے سہی۔

گلاب۔ ہرگز نہیں۔ اگر ضد ہو تو ایک صورت ہو سکتی ہے۔ دلی والوں کا ایک
قافلہ اس راہ سے گذر رہا ہے۔ یہ لوگ پانچ چھ ہزار سے کم نہیں۔ تمہیں بھی
ان کے ساتھ کر دیا جائے تو ان بیچاروں کی بھی حوصلہ افزائی ہو گی۔ تم
بہادر ہو، نڈر مجاہد۔

طارق۔ قافلہ کے فوجی نگران ہمیں ہتھیار لے کر کب چلنے دیں گے۔ یہ بدبخت
تو نہتوں پر حملہ کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

گلاب۔ اس بات کی فکر نہ کرو۔ ہمارے ساتھی تمہارے ہمراہ ہوں گے۔ میں
جاسوس بھیج کر معلوم کرتا ہوں کہ یہ قافلہ اس وقت کہاں ہے اور کب
یہاں سے گذرے گا۔

طارق۔ یار میرا تو جی چاہتا ہے کہ میں بھی اس جاسوس کے ساتھ جاؤں۔ سر پہ
ہیٹ پہن لوں گا۔ ویسے تو ہم لوگ تھے ہی فوجی، ڈوگروں کے لباس

میں لیکن اب یہ لباس بوسیدہ ہو چکا ہے۔ باقی رہے یہ موجودہ کپڑے تو بھائی یہ تمہاری امانت ہیں۔ پاکستان جاتے وقت واپس کر دیں گے۔

گلاب ۔ اس بکواس کو چھوڑو۔ ہم لوگ تیرے میرے کے قائل نہیں۔ یہاں سب مشترکہ کھاتا ہے۔ گلاب کے کپڑے تو در کنار اس کی جان بھی تمہاری ہے۔

طارق ۔ شکریہ۔ خدا میری جان کو سلامت رکھے۔ کیا یہ مناسب نہیں کہ ہماری بوسیدہ وردیاں دھلوائی جائیں۔ ممکن ہے کہ کبھی ان کی ضرورت پیش آ جائے۔

گلاب ۔ بھئی پولیس اور فوج کی نئی وردیاں اور ہر مناسب سازوسامان کا ذخیرہ اپنے یہاں موجود ہے۔ اطمینان رکھو وقت پر سبھی کچھ مل جائے گا۔

اس فقرے کے جواب میں طارق کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اچانک ایک شور سا اُٹھا اور دور کوئی نصف میل کے فاصلے پر گرد کا بادل اُٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ پھر اچانک گولیوں کی آواز سنائی دی۔ گلاب نے اچانک بندوق اُٹھائی اور اپنے چند ساتھیوں کو تقلید کا اشارہ کر کے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ سجن بھی اس کے پیچھے جانے لگا اور طارق اور خالد نے بھی ساتھ دینے کی ٹھان لی۔ لیکن اُس نے مصلحتاً روک دیا۔ گرد اُڑتی رہی اور بندوقیں چلتی رہیں۔ اسلحہ کی آواز سے گرد کے بادل گرجتے رہے۔ آخر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ اب فضا میں چیلوں کے جھنڈ منڈلاتے نظر آئے۔ اس زمانے میں ان جانوروں کو انسانی گوشت کا چسکا پڑا ہوا تھا اور یہ اس قدر نڈر ہو چکے تھے کہ بعض مقامات پر جیتے جاگتے، کھیلتے کودتے بچوں پر بھی حملہ کر دیتے تھے۔ یہ بھی زمانے کے انقلابات کی نیرنگیاں تھیں کہ کرگس شاہین بچوں کو دبوچنے کے لئے لپکتے،

بچھڑے شیروں کو آنکھیں دکھاتے تھے خاک سمرقند سے لے کر راس کماری تک شمشیر زنی کرنے والوں کی اولاد نہتی تھی اور ہمالیہ کے غاروں میں تپسیا کرنے والے بندوقیں لیے پھرتے تھے۔ خدا کی شان کہ مارنے والے متفق و متحد تھے اور مار کھانے والوں کی ٹولیوں میں اب بھی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ بعض مولوی صاحبان اس وقت بھی مظلوم ہی کو موردِ الزام ٹھہراتے اور بعض فرماتے کہ تم نے پاکستان کا مطالبہ کیا ہی کیوں تھا۔ تم یہ لفظ زبان پر نہ لاتے تو آج پٹتے بھی نہیں۔ کئی علماء ریل میں سفر کرتے ہوئے اور کئی گھروں کی چاردیواری میں خوب مزے سے بیٹھے۔ آج بھی ایسے مولوی موجود ہیں جن کے نزدیک پاکستان کی امداد کرنا خلافِ شریعت ہے، محض اس لئے کہ پاکستان میں اسلامی قانون نافذ نہیں لیکن یہ عقل کے اندھے اتنا نہیں سوچتے کہ پاکستان کی کمزوری سے جس ملک کو فائدہ پہنچنے کا احتمال ہو وہ تو اسلام سے کوسوں دور ہے۔ اگر پاکستان قائم رہا تو ہم کبھی نہ کبھی اسلامی قانون بھی نافذ کر سکیں گے۔ اور جو خدانخواستہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہی نہ ہوا تو سب تمناؤں کا خون ہو گا۔ دعا ہے کہ خدا ایسے اصحاب کو دماغی صحت عطا فرمائے۔

اب شور و شغب کی آواز بتدریج مدھم ہوتی چلی گئی اور چیلوں کی ٹولیاں منڈلاتی ہوئی نیچے اتر آئیں جس سے طارق اور خالد نے اندازہ لگایا کہ مرنے والے مر چکے ہیں اور مارنے والوں کا گروہ جا چکا ہے۔ یہ ابھی کچھ سوچ ہی رہے تھے کہ گلاب اپنے ساتھیوں سمیت آ گیا۔ دو سسکتے ہوئے زخمی اس کے ساتھ تھے۔ اس نے گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا:۔

گلاب۔ اتنے بڑے قافلے سے صرف یہی دو بچے ہیں۔ حالت ان کی بھی مخدوش

ہے۔ لو ذرا انھیں بستروں پر لٹا دو۔ میں مرہم پٹی کا سامان لے آؤں۔

طارق۔ کہاں سے؟

گلاب۔ یہی گاؤں سے۔ عارضی علاج تو وہیں میدان ہی میں کر دیا گیا تھا۔

طارق۔ گاؤں جا رہے ہو تو سعیدہ، نسیمہ اور پریمو کو بھی لیتے آؤ۔ تیمارداری کرینگی زخمیوں کی دیکھ بھال کے لئے عورت مرد سے بہتر ہے۔

گلاب۔ (حیرانی سے) مگر یہاں لے آؤں؟

طارق۔ کوئی ڈر نہیں۔ جہاں تمہارا لاؤ لشکر رہتا ہو وہاں دشمن نہیں آسکتے۔

گلاب۔ اچھا جس طرح تمہاری مرضی۔

اس کے بعد گلاب گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا گاؤں کی طرف چلا گیا۔ طارق نے چند دوستوں کی مدد سے زخمیوں کو ایک پُرسکون جگہ پر لٹا دیا۔ کوئی گھنٹے بھر کے اندر گلاب، نسیمہ اور پریمو بھی پہنچ گئے۔ ابھی وہ گھوڑوں سے اتر ہی رہے تھے کہ خالد نے بے تابی سے پوچھا:۔

خالد۔ بھئی وہ سعیدہ کہاں ہے۔ اسے کیوں نہیں لائے؟

گلاب۔ اُسے ان لڑکیوں کی نگرانی کے لئے چھوڑ آیا ہوں جو ہماری حفاظت میں ہیں۔

طارق۔ ہاں یار ٹھیک کیا ہے تم نے۔

خالد۔ (نسیمہ کی طرف دیکھ کر) ہاں تمہارے نزدیک تو بہت ٹھیک ہے۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ نسیمہ اور پریمو زخمیوں کی طرف متوجہ ہوئیں۔ یہ بیچارے ابھی تک غشی کے عالم میں تھے۔ ایک کی حالت تو بے حد مایوس کن تھی۔ پریمو نے ایک ماہر نرس ہونے کی حیثیت میں اسے بچانے کی بہت کوشش کی مگر وہ غریب

چل ہی بسا۔ آخر اس کو بھی پیرجی کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اب ذرا دوسرے زخمی کی سنیئے۔ یہ ذرا سخت جان تھا۔ تین دن کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ جونہی اس کی نظر نسیمہ کے چہرے پر پڑی وہ دیوانہ وار اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ لیکن کمزوری کی وجہ سے پھر غشی طاری ہوگئی۔ ان لوگوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ چند لمحوں کے بعد اس نے پھر آنکھیں کھولیں اور چلانے لگا:۔

زخمی۔ نسیمہ نسیمہ تم یہاں ہو زندہ و سلامت۔

نسیمہ حیران تھی کہ کیا جواب دے۔ معاملہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کچھ کہنے کی بجائے وہ طارق اور خالد کی طرف دیکھنے لگی۔ زخمی جس کا دھیان خالد اور طارق کی طرف ابھی نہیں گیا تھا بے تابی سے کہنے لگا:۔

زخمی۔ اُدھر کیا دیکھتی ہو۔ بتاؤ طارق اور خالد کہاں ہیں؟ کیا شہید ہو گئے؟

طارق۔ بھئی ہم یہاں ہیں تمہارے بائیں طرف۔

زخمی نے جونہی پہچانا تڑپ کر اُٹھا اور رونے لگا، طارق اور خالد سے بغل گیر ہوا۔ اس وقت شاید اُسے اپنے زخموں کی تکلیف کا بھی احساس نہیں تھا۔ ذرا توقف کے بعد طارق نے اس کی گھنی ڈاڑھی اور زخمی چہرے پر جو پٹیوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا غور سے نظر ڈالتے ہوئے کہا:۔

طارق۔ دوست ہم تمہیں پہچان نہیں سکے۔

زخمی۔ یہی معلوم ہوتا ہے۔ حلیہ درست ہوتا تو پہچان بھی لیتے۔ میں ہوں حمید کا بھائی لطیف۔ مسلم آباد سے روانگی کے بعد جب پریم نگر کے قریب ہم پر حملہ ہوا تھا تو مجھے زخمی حالت میں اغوا کر کے لے گئے تھے۔ اچھی طرح یاد ہے کہ

بعض دشمن میرے بھائی حمید کو بھی پکڑ کر لئے جا رہے تھے۔ اب مر چکا ہوگا بیچارہ۔

اور میں مر مر کر بھی زندہ ہوں۔

خالد۔ (سجن کو آگے بڑھاتے ہوئے) ان سردار صاحب کو جانتے ہو؟

لطیف۔ ان کی قوم کو جانتا ہوں۔ افسوس انھیں نہیں جانتا۔

طارق۔ تم انھیں نہیں جانتے۔ تو سمجھ لو کہ حمید کو نہیں جانتے۔ لو میں تعارف کرائے دیتا ہوں۔ یہ ہیں سردار سجن سنگھ صاحب عرف حمید برادر شما۔

(پھر سجن سے مخاطب ہو کر) لو بھئی یہ تمہارا بھائی لطیف زندہ و سلامت مل گیا ہے۔ اب ذرا اپنی ڈاڑھیوں کو گلے ملنے دو۔

(اس فقرے پر سب کے سب ہنس دئے۔)

حمید لطیف سے دیوانہ وار لپٹ گیا۔ فرطِ مسرت سے سب کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ چند منٹ کے بعد لطیف نے حمید کی ڈاڑھی کی طرف دیکھ کر کہا:۔

لطیف۔ بھائی یہ ڈاڑھی کہاں سے بنوائی تھی تم نے؟

حمید۔ بھئی میں نے تو دہلی میں رنکین کو آرڈر دیا تھا۔ اور تم نے؟

لطیف۔ میں نے تو شملہ میں براڈوے سے خریدی تھی۔

(سب ہنس دئے)

لطیف۔ نہیں نہیں مذاق نہیں۔ میری ڈاڑھی واقعی قیمتی اور مصنوعی ہے۔ زخموں سے خون بہنے کی وجہ سے چپک گئی ہے۔ سردست اتارنا درست نہیں۔ تکلیف ہوگی۔

حمید۔ لیکن میاں صاحب ہماری ڈاڑھی تو اصلی ہے۔ سولہ آنے اصلی۔ ہماری اپنی

پیداوار۔

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ گلاب بھی جو ابھی تک حویلی کے کسی دوسرے حصہ میں گھسا ہوا تھا آگیا۔ حمید نے مفصل طور پر تعارف کرایا۔ لطیف اس سے بھی مل کر بہت خوش ہوا۔ اب ہر طرف سے مطالبہ کیا جانے لگا کہ لطیف اپنی سرگزشت بیان کرے، لیکن گلاب نے منع کرتے ہوئے کہا کہ اس کی صحت تو درست ہو لینے دو۔ سخت کمزور اور زخمی ہے۔ محض تمہاری محبت کے جوش میں باتیں کئے جا رہا ہے ورنہ اس سے تو اتنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ابھی آرام کرنے دو۔ دو تین دن کے بعد سن لینا۔ میں نے حویلی میں ایک کمرہ درست کروا دیا ہے وہاں لے چلو۔ گلاب کے حکم کی تعمیل کی گئی اور زخمی کا باقاعدہ علاج شروع ہو گیا۔

عمل کی آگ سے دنیا جلا دے

کہ یہ ظلمت کدہ پھر جگمگا دے

جہاں میں چار سو توحید پھیلا

اگر تجھ کو کبھی ہمت خدا دے

(وکی وارثی)

(۲)

آج لطیف کو آئے ہوئے کوئی تین ہفتے گزر چکے تھے۔ وہ تقریباً تندرست ہو چکا تھا۔ چند خراشیں باقی تھیں۔ اب تو مصنوعی ڈاڑھی بھی اُتر چکی تھی۔ چہرے کی زردیوں میں سرخیاں جھلکنے لگیں۔ خوبصورت موٹی موٹی آنکھوں کی چمک لوٹ آئی۔ اس کی تیمارداری میں پریمو کا بہت ہاتھ تھا۔ یہ شب و روز اس کی خدمت میں کوشاں رہتی، کھانے پینے کا خاص طور پر خیال رکھتی۔ گھر میں دودھ، دہی، مکھن اور گھی کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ ہر ایک قوت بخش غذا زخمی کی بحالی کے لئے فراخ دلی سے دی گئی۔ ان تمام ملی جلی تدبیروں سے لطیف میں ایک نیا حسن پیدا ہو گیا۔ پریمو کی خدمت گزاری کا یہ حال تھا کہ تمام تمام رات مریض کی چارپائی کے پاس گزار دیتی اور اس کے اصرار کے باوجود بھی آرام کے لئے نہ جاتی۔ جس وقت دیکھتی کہ زخمی کی آنکھ لگ گئی ہے تو چپ چاپ حویلی کے پچھواڑے باغ میں چلی جاتی اور وحشیوں کی طرح کبھی چاند کبھی ستاروں سے باتیں کرتی، کبھی گانے لگتی۔ گلاب کی یہ حویلی ایک محفوظ ترین مقام پر تھی جس کی حفاظت کے لئے تین چار سو کے قریب مسلح جوان ہر وقت تیار رہتے تھے۔ یہ لوگ عمارت سے کافی فاصلے پر باغ کی بیرونی حدود پر ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ دوسری وجہ یہ کہ یہ علاقہ اب مکمل طور پر سکھوں کے قبضے میں تھا جہاں کسی غیر کے حملے کی جرأت نہ تھی۔

ایک دن چاندنی رات میں جب کہ ہر کوئی محوِ خواب تھا پریمو جذبات کی رو

میں تھپیڑے کھاتی ہوئی باغ میں آئی۔ وہ اس وقت انتہائی طور پر بے قرار معلوم ہوتی تھی۔ شاید اُسے کسی کا خیال ستا رہا تھا، کسی کی محبت گدگدا رہی تھی۔ چاندنی رات، خاموش مقام، باغ و بہار، جوانی کے دن اور پھر ایک محبت بھرا دل۔ یہ تمام ساز و سامان قدرتاً خوابیدہ جذبات کو بیدار کر کے ہی رہا کرتے ہیں۔ ایک شاعر نے خوب کہا ہے:۔

شبِ مہتاب میں جب سبزہ کہسار کھِلتا ہے
فلک سے فطرتِ ویران کو جب حسن ملتا ہے
قیامت میری خوابیدہ تمناؤں میں آتی ہے (ولی وارثی)

بس کچھ ایسی ہی کیفیات لئے ہوئے پریمو گلستانِ تنہائی میں آنکلی۔ اس وقت ماحول نے اس کی خوابیدہ تمناؤں میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔ وہ مجبور تھی، دل کے ہاتھوں مجبور، اس دل کے ہاتھوں جس میں ایک ناسور پیدا ہو چکا تھا۔ باغ میں ایک کھُلے سرسبز مقام پر ٹھہر کر اس نے سسکیاں لے لے کر رونا شروع کیا۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی تو ایک جگہ بیٹھ کر کچھ سوچنے لگی کہ اچانک ایک درخت سے پپیہے نے درد بھرے لہجے میں پوچھا "پی کہاں"؟ جب کوئی جواب نہ ملا تو اس نے پھر دریافت کیا "پی کہاں؟" "پی کہاں؟"۔۔۔۔

اب کی پریمو سے بھی نہ رہا گیا اور اس کے جذبات ایک دردناک گیت کی شکل میں ظاہر ہونے لگے:۔

گیت

پریم کے بول نہ بول پپیہے — پریم کے بول نہ بول

پریتم کی سیوا میں جاکر
جا کہیو یہ سیس نوا کر
پریم کے گیت سنانے والے
پیار کی ریت سکھانے والے
تجھ بن اک ناری مرتی ہے
جیون بے جیون کرتی ہے
جیون ہے انمول پپیہے جیون ہے اَن مول
پریم کے بول نہ بول

(وکی وارتی)

پریمو گا رہی تھی۔ رات کے سناٹے میں چند اسی قسم کے دل جن کی آنکھیں نیند سے نا آشنا تھیں اس نغمۂ فراق کو سن رہے تھے۔ اتنے میں ایک شخص آہستہ سے باغ میں داخل ہوا اور پریمو کی پچھلی طرف قریب ہی کھڑا ہو کر کہنے لگا:۔

شخص۔ میں تو ہر وقت سایے کی طرح تمہارے ساتھ رہتا ہوں پھر یہ برہا کا گیت کیوں گایا جا رہا ہے؟

پریمو۔ یہ درست ہے کہ بظاہر تم ہر وقت میرے قریب رہتے ہو لیکن جب تک عہد و پیمان نہیں ہوتے اور دنیا کے دستور کے مطابق میں آپ کو حاصل نہیں کر لیتی اُس وقت تک میں یہ سمجھوں گی کہ آپ مجھ سے کوسوں دور ہیں۔

شخص۔ عہد و پیمان تو ہو چکے ہیں مدت سے بلکہ ہمارے والدین ایک دوسرے سے ہمیں منسوب کر چکے ہیں' نسیمہ۔

نسیمہ کے لفظ سے چونک کر پرمیو نے پلٹ کر جو دیکھا تو طارق کھڑا اظہارِ محبت کر رہا تھا۔ دونوں کی آنکھیں شرم و حیا سے جھک گئیں۔

طارق۔ بہن معاف کرنا، مجھے افسوس ہے کہ ـــــ

پرمیو۔ (بات کاٹ کر) افسوس تو مجھے ہونا چاہیئے کہ میرا راز کھل گیا۔ باقی رہا آپ کا قصہ تو یہ کوئی چھپی بات نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ نسیمہ آپ کی منگیتر ہے۔ نسیمہ اور آپ کی محبت کی کہانی میں پہلے ہی سے جانتی ہوں۔

اتنے میں نسیمہ آگئی اور کہنے لگی:۔

نسیمہ۔ شکر ہے کہ اب آپ کو بھی کسی سے محبت ہوئی۔ میں بھی ایک درخت کی اوٹ میں چھپ کر یہ سب تماشا دیکھ چکی ہوں۔ ذرا یہ بھی تو بتا دو کہ وہ حضور کون ہیں۔ کہیں یہی زخمی تو نہیں کہ جن کو تمہاری مسیحائی نے دوبارہ زندہ کر دیا ہے کبھی اس سے کبھی اظہارِ خیال بھی کیا۔

پرمیو۔ ایک بار۔

نسیمہ۔ تو کیا کہا ہے اُنہوں نے؟

پرمیو۔ فرماتے ہیں کہ میں اپنے محسن کے گھر ڈاکہ نہیں ڈال سکتا۔ جبتک تمہارے والدین اس بندھن کو پسند نہیں کریں گے میں تیار نہیں ہوں گا۔

طارق۔ یہ تو اس نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ تم خود ہی سوچو کیا تمہارے والدین اس رشتے کی اجازت دیں گے۔

پرمیو۔ میں بھیا کو تو منا لوں گی۔

طارق۔ گلاب کی تو چھوڑو۔ وہ تو ست سنگی ہے شاید مان ہی جائے مگر تمہارے

والد صاحب؟

اتنے میں لطیف بھی آگیا اور کہنے لگا:-

لطیف - بھائی طارق، پرمیو کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔ اس کی بدولت میری جان بچ گئی ورنہ میں کب کا مر چکا ہوتا۔ اب یہ اپنے احسان کے بدلے میں میری محبت طلب کرتی ہے لیکن میں مجبور ہوں۔ گلاب میرے بھائی کا پرانا دوست ہے۔ ویسے بھی اس نے ہم سب کو موت کے منہ سے بچایا ہے۔ کیا اس کے احسانات کے بدلے میں ہم اس قدر ذلیل حرکت کے مرتکب ہو سکتے ہیں؟ یہ درست ہے کہ محبت کرنا گناہ نہیں لیکن اس کے لیے سماج اور دنیا کی اجازت بھی تو ہو۔

پرمیو - کیا یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے -

لطیف - بالکل -

پرمیو - میں تو خودکشی کرلوں گی۔

گلاب - (اچانک نمودار ہوکر) اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ چونکہ میں فرقہ وارانہ عقائد کا حامی نہیں اس لیے مجھے اس شادی پر اعتراض بھی نہیں ہوگا۔ میں تعصب کی دیوی پر اپنی پیاری بہن کو قربان نہیں کرنا چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ اس کا ارادہ اٹل ہے۔ ناکامی کی صورت میں وہ ضرور مر کر رہیگی۔ گزشتہ کئی دنوں میں اس کی کیفیت مجھ پر بخوبی ظاہر ہو چکی ہے۔ میں راتوں کو اُسے روتے دیکھ چکا ہوں۔ میں کوشش کروں گا کہ پتا جی بھی اس کی راہ میں روڑا نہ بنیں۔ اب اس مضمون پر سوچنا بے کار ہے۔ چلو آرام کرو۔ رات

تو بہت بیت چکی ہے۔

گلاب کی گفتگو کے جواب میں سب خاموش تھے اور نہیں جانتے تھے کہ اس عجیب و غریب شخص کی باتوں کا کیا جواب دیں۔ وہ دنیا کے تعصبات سے اس قدر آزاد تھا کہ شاید ہی کوئی اور ہو۔ اس کا مذہب صرف انسانیت تھا۔ اس کے نزدیک ایک عورت کے لئے ایک شریف مرد کی ضرورت تھی خواہ وہ کسی گروہ، کسی ملک اور کسی مذہب سے متعلق ہو۔ گردنیں جھکائے اور دلوں میں سوچتے ہوئے سب اپنی اپنی آرام گاہ میں چلے گئے۔

دن رات گزرتے گئے اور لطیف کی صحت ترقی کرتی گئی حتیٰ کہ وہ بالکل صحتیاب ہو گیا۔ پریمو کے بارے میں وہ اب بھی متذبذب تھا۔ اگرچہ وہ نسیمہ کے ہمراہ گاؤں بھیجی جا چکی تھی لیکن ہر دوسرے تیسرے یہ سب کی سب حویلی میں تفریح کے بہانے آہی جاتیں۔ اکثر آموں کے پیڑوں کے نیچے محبت، شکوہ و شکایت کی طویل بحثیں چھڑ تیں جن سے اکتا کر بعض دفعہ پپیہے اڑ جاتے اور کوئلیں اپنا نغمہ ختم کر دیتیں۔ لیکن ان لوگوں کو ان جھگڑوں میں بھی مزا ملتا۔ یہ کبھی سودائیوں کی طرح رونے لگتے۔ کبھی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے، کبھی روٹھتے اور کبھی ایک دوسرے کو مناتے۔ خالد اور سعیدہ، طارق اور نسیمہ تو خیر جو کچھ تھے سو تھے ہی، مزا تو یہ ہے کہ اب پریمو اور لطیف بھی ایک دوسرے کو لازم و ملزوم سمجھنے لگے تھے۔ گلاب کی آزاد خیالی نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ باہمی میل ملاپ اور پریمو کی مستقل مزاجی نے آخر لطیف کو بھی مجبور کر دیا کہ وہ غیر مشروط طور پر نباہ کا وعدہ کرے۔ ہر روز کے واویلوں سے وہ بہت متاثر ہو چکا تھا۔ آخر اس کی مصلحتوں نے محبت کے سامنے

ہتھیار ڈال دیے اور اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا:۔

لطیف۔ اُف پریم تم نے میرے سر اور چہرے کے زخم مندمل کر کے دل میں ایک ناسور پیدا کر دیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اب کیا کیا جائے۔

پریمو۔ آپ سب کچھ جانتے ہیں۔

لطیف۔ مگر بہ تقاضائے حالات مجبور ہوں۔

پریمو۔ جس محبت کی راہ میں مجبوریاں حائل ہوں وہ ناقص ہے۔ آؤ ان مجبوریوں کے پہاڑ اپنے ارادوں کے زلزلوں سے توڑ پھوڑ دیں۔ گلاب اپنی رائے ظاہر کر چکا ہے۔ اب تمہیں لیت و لعل سے کام نہیں لینا چاہیئے۔

لطیف۔ تو کیا تم برضا و رغبت اسلام قبول کر لوگی؟

پریم۔ تمہاری خاطر تو مجھے جہنم بھی منظور ہے۔ اسلام میں تو پھر فردوس کی بہاریں ہیں۔

لطیف۔ میرے سر کی قسم؟

پریمو۔ تمہاری اور اپنی قسم میں آج سے مسلمان ہوں۔

لطیف۔ اب تمہاری حفاظت ہم پر فرض ہو چکی ہے۔

طارق۔ (عقب سے آتے ہوئے) یہ راز سر دست راز ہی رہے۔

گلاب۔ (بائیں جانب سے آتے ہوئے) ارے مجھ سے بھی چھپاؤ گے؟

طارق۔ تم سے تو ہم خود نہیں چھپ سکتے تو راز کیا خاک چھپے گا۔ آؤ بیٹھو موسم اچھا ہے۔ آج لطیف کی آپ بیتی سن کر رہیں گے۔

لطیف۔ باقی ممبروں کو بھی بلوا لو ورنہ میں بار بار نہیں سناؤں گا۔

گلاب نے آواز دی تو سجن، سعیدہ، نسیمہ اور خالد بھی آ گئے۔ جب سب اطمینان سے بیٹھ گئے تو لطیف نے داستان شروع کی۔

زندگی کیا ہے فقط ایک گماں ہے اے دوست
دائمی زیست پسِ مرگِ نہاں ہے اے دوست
اب تو پانی ہے ترے سر سے گذر جانے کو
ساعتِ مصلحت و فکر کہاں ہے اے دوست
(ولی وارثی)

(۳)

"پریم نگر سے اِدھر جب ہماری فوجی گاڑی پر حملہ ہوا تو میں لاشوں کے ایک انبار کی اوٹ میں لیٹ گیا۔ یہ مرنے والے وہی لوگ تھے جو مسلم آباد کے مشن ہسپتال سے ہم سے ذرا پہلے روانہ ہوئے تھے۔ اس وقت حمید، رشید اور خالد آپ کے ہمراہ مجھ سے کچھ دور نیم مردہ لاشوں کی دیکھ بھال فرما رہے تھے۔" لطیف نے کہا۔

طارق۔ ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ میری آنکھیں اب بھی تصور میں وہ نقشہ دیکھ رہی ہیں۔

لطیف۔ لاشوں میں چھپتے چھپتے ایک گولی نے مجھے آ ہی لیا اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ جب آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ میں ایک پہاڑی مقام پر ہوں۔ ایک شخص میری تیمارداری میں مصروف تھا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ مقام سولن ہے شملہ اور کالکا کے درمیان۔ یہ ایک مذہبی خیالات کا انسان تھا مگر تشدد اور نفرت سے پاک۔ اس کی تمنا تھی کہ دنیا کا ہر شخص سناتن دھرم کے اصول اپنا لے۔ چونکہ یہ ایک کروڑپتی تھا، دھن دولت کی پرواہ نہ تھی اس لئے اس نے اپنی زندگی مذہب کی اشاعت کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ ان دنوں وہ ڈاکوؤں، رہزنوں اور حملہ آوروں سے مسلمان زخمیوں کو خرید کر اپنے ہسپتال میں لے آتا اور اُن کی صحت درست ہو جانے

کے بعد حد نہایت سلوک اور محبت سے تبدیلِ مذہب کی ترغیب دیتا۔ مگر بہت سی دولت اور کوشش صرف کرنے کے بعد بھی خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اس کے قبضے میں آنیوالے لوگ ہندو تو ہو جاتے مگر دکھاوے کے لئے۔ دو چار مہینے خوب مزے کرتے اور جب کبھی موقع ملتا بھاگ جاتے۔ وہ مجبور تھے! ان مہاتماجی کو تو چھوڑیئے وہ تو تھے ہی فرشتہ سیرت، عام ہندوؤں کا طرزِ سلوک ان شدھ ہو جانے والوں سے اچھا نہ ہوتا تھا۔ یہ لوگ تبدیلِ مذہب کے باوجود انھیں ٹھکانے لگا دیتے تھے۔ اس لئے ہندو ہونا نہ ہونا برابر تھا۔

کوئی دو ہفتے کی تیمارداری کے بعد مجھے مکمل صحت ہوگئی تو مہاتماجی نے کہا:۔

مہاتماجی۔ بیٹا تمہیں معلوم ہے کہ کس نے تمہاری جان بچائی ہے؟

میں۔ نہیں جناب۔

وہ۔ ایشور نے۔ اس نے مجھے حکم دیا اور میں نے پانچ سو روپے میں تمہیں مورکھوں سے خرید لیا۔

میں۔ آپ کی مہربانی۔

وہ۔ اب میں تم سے ایک آشا (امید) رکھتا ہوں۔

میں۔ فرمایئے۔

وہ۔ تم شدھ ہو جاؤ۔ اپنی اوستھا (عمر) ضائع نہ کرو۔ رام رحیم ایک ہی بات ہے۔

میں۔ جب ایک ہی بات ہے تو تبدیلی کی ضرورت؟

وہ۔ یہ مورکھ لوگ کٹھور ہیں ظالم ہیں تم نہیں سمجھتے۔ اگر زبان کے تغیر کی وجہ

تمہاری جان بچ جائے تو کیا بُرا ہے۔

میں - جناب میں سوچ کر بتاؤں گا۔

وہ - ہاں وچار کر لو - کل بتانا۔

اسی روز میرے ایک ساتھی نے جس کا نام حیدر تھا مجھے مشورہ دیا کہ ظاہرداری کے لئے میں شدھ ہو جاؤں - اس کا ذاتی پروگرام بھی ایسا ہی تھا - لہٰذا دوسرے روز ہم دونوں ہندو بن گئے - مہاتما جی بہت خوش ہوئے - ہماری بڑی تواضع کی - چونکہ دل کے صاف تھے اس لئے ہم پر کوئی شک کئے بغیر دو دو سو کی رقوم جیب خرچ کے طور پر دیں تاکہ ہم خوش خوش رہیں اور بار بار دستِ طلب دراز نہ کرنا پڑے - ایک دن حیدر نے شملہ جانے کی اجازت چاہی تو کہنے لگے۔

مہاتما جی - پہلے بھی بہت سے لوگ شملہ گئے ہیں لیکن آج تک نہیں لوٹے - کیا احسان کا بدلہ بے وفائی ہے۔

میں - مہاتما جی کیا پانچوں انگلیاں ایک جیسی ہیں ؟

مہاتما - ایک جیسی تو نہیں لیکن ایک دوسرے سے جدا بھی کہاں ہیں -

میں - آپ اطمینان رکھیں کسی لالچ کی وجہ سے ہم شدھ نہیں ہوئے اور نہ ہی ہم بُزدل ہیں - اگر ایسا ہوتا تو پہلے ہی دن آپ کی دعوت قبول کر لیتے -

مہاتما - اچھا جاؤ، جلدی لوٹ آنا -

پس اسی دن دوپہر کی گاڑی سے ہم روانہ ہو گئے اور کوئی دو بجے شملے پہنچ گئے - یہاں ایک ہوٹل میں ٹھہرے - سیر کے لئے مہاتما جی نے ہمیں پانچ سو روپے عطا فرمائے تھے - میں نے اور حیدر نے ایک انگریزی دوکان سے دو خوبصورت

داڑھیاں خریدلیں اورکسی آنے والے وقت کے لئے بکسوں میں محفوظ کرلیں۔ پھر کوئی ہفتہ عشرہ شملے کی سیر کر لینے کے بعد واپس سولن جانے کی ٹھان لی۔ دوسرے دن مہاتماجی کی خدمت میں جا حاضر ہوئے۔ انھیں ہماری واپسی کی امید ہی نہیں تھی۔ اور وہ ایک شخص سے فرما رہے تھے "بھئی میں تو ہر طرح کی کوشش کرتا ہوں کہ یہ لوگ سناتن دھرم میں شامل ہوکر مکتی حاصل کریں لیکن ایشور انھیں استقامت نہیں بخشتے۔ بتاؤ میرا کیا قصور ہے۔ جب تک جیتا ہوں جتن کئے جاؤں گا۔ آگے اس کی مرضی۔" یہ فقرہ ختم ہوا ہی تھا کہ ہم جا پہنچے۔ بس پھر کیا تھا مہاتماجی کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ انھوں نے تعجب اور مسرت کے ملے جلے لہجے میں کہا:-

مہاتماجی۔ تم آگئے؟

میں۔ آتے کیوں نہ، گورو!

مہاتماجی۔ (تعجب سے) گورو، میں گورو۔

حیدر۔ ہاں ہاں۔ ہم نے آپ کی بدولت سیدھا راستہ دیکھا ہے۔

مہاتماجی۔ راستہ تو وہ بھی سیدھا تھا۔

میں۔ لیکن اس راستے میں جسم اور روح دونوں محفوظ ہیں۔

مہاتماجی۔ (خوشی سے) بس اب تم ٹھیک سمجھے ہو۔ لو گیانی جی صرف یہی دو میری محنت کا پھل ہیں۔ اب مجھے ان پر پورا بھروسہ ہے۔

گیانی جی۔ میں آپ کو مبارکباد اور انھیں آشیرباد دیتا ہوں۔ اب جو میری رائے پوچھو تو یہ ہے کہ انھیں شملے میونسپل دفتر میں ملازم کرادیا جائے تاکہ

اپنی ضروریات خود پوری کر سکیں۔ آخر کب تک آپ پر بوجھ بنیں گے؟

گیانی جی کی رائے مجھے بھی پسند آئی اور میں نے مہاتما جی کو سمجھا بجھا کر اس بات کے لئے راضی کر ہی لیا۔ دو چار روز کے بعد ہمیں شملے میں ملازمت دلوا دی گئی۔ اب میرا نام روشن اور حیدر کا چمن تھا۔ کوئی چار پانچ ماہ کی مدت کے بعد ہماری طبیعت اکتانے لگی۔ ہر طرف نفرت ہی نفرت اور بغض ہی بغض دیکھنے میں آتا۔ لوگ ہمیں پاکستان کا جاسوس سمجھتے اور بعض کہتے کہ جنہوں نے اپنے دین سے وفا نہیں کی وہ ہمارے کب بنیں گے۔ کبھی ہمیں قتل کی دھمکیاں دی جاتیں۔ گمنام خطوں میں لکھا جاتا کہ یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ تمہیں مروا دیا جائے گا۔ بلکہ اسی قسم کے چند شقی القلب لوگوں نے ایک رات ان مہاتما جی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اُن بے چاروں پر مسلم پروری کا الزام لگایا گیا تھا۔ لاش ٹکڑے ٹکڑے کر کے ایک کھڈ میں پھینک دی گئی۔ جب گیانی جی نے ہمیں یہ خبر سنائی تو ہم نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ کوئی تین دن تک یونہی قید رہنے کے بعد ہم نے بھیس بدلا اور شملے سے بھاگ نکلے۔ بارش کی کثرت اور بادلوں کی تاریکیوں نے ہمیں اپنی آغوش میں چھپا لیا۔

اب میں تھک گیا ہوں۔ باقی داستان کل سناؤں گا۔ اب مجھے بخشو۔ ذرا آرام کر لوں۔

لطیف نے جمائی لیتے ہوئے معذرت چاہی تو نسیمہ نے شوخی سے کہا۔

نسیمہ۔ جاؤ ہم نے بہن پریمو تمہیں بخش دی۔

سب نے ایک قہقہہ لگایا اور محفل برخاست ہو گئی۔

دوسرے روز جب منڈلی کے لوگ اکٹھے ہو گئے تو لطیف نے آپ بیتی سنانی شروع کی :-

"شملے سے رخصت ہوتے وقت ہم لوگ سادھو بن چکے تھے۔ پہلے انبالے پہنچے اور یہاں سے ریل میں سوار ہو کر امرت سر کی طرف چلے۔ اس ٹرین میں پچانوے فی صدی مسلمان مہاجر سوار تھے جن کی حفاظت کے لئے ڈوگروں کی ایک پلٹن بھی ساتھ تھی۔ ان کے علاوہ چند ہندو سکھ مسافر بھی تھے۔ ہم انھیں لوگوں میں جا بیٹھے۔ مسلمانوں کے رنگ ہلدی کی طرح زرد اور آنکھیں اُداس تھیں۔ عورتیں گود کے بچوں سے بیزار معلوم ہوتی تھیں اور خاوند بیویوں سے نالاں۔ ہندو اور سکھ بھی افسردگی سے خالی نہیں تھے۔ اگرچہ انھیں کوئی خطرہ نہیں تھا پھر بھی ماحول کے اثر سے متاثر تھے۔ یہ مسافر نہ جانے کتنی دور سے آئے تھے۔ نہ جانے انھوں نے کتنی لاشوں اور کتنے حادثوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔ لاشیں خواہ دشمن ہی کی کیوں نہ ہوں پھر بھی انسان انسان کی نعش دیکھ کر اثر پذیر ضرور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چور، ڈاکو، ظالم اپنی بربریت کے وقت شراب اور دوسری نشہ آور اشیاء استعمال کر لیتے ہیں جن سے انسان وقتی طور پر حیوان بن جاتا ہے۔ خیر گاڑی چلی اور گاڑی کے بدنصیب مسافر کھڑکیاں بند کر کے اندر دبک گئے۔ ٹرین منزل بہ منزل رکتی ہوئی لدھیانہ کے اسٹیشن پر پہنچی۔ یہاں دشمنوں کی لاتعداد جماعت بندوقوں، رائفلوں اور تلواروں سے مسلح کھڑی تھی۔ چند لوگ ہمارے ڈبے کی طرف آئے اور کہنے لگے ہندو سکھ بھائیو باہر آجاؤ اور جا اسٹیشن کے کمروں میں گھس جاؤ تو اچھا ہے۔ ہمارے ویر دشمنوں پر دھاوا بولنے والے ہیں۔ ہمیں بھی سادھو سمجھ کر نہایت عزت و

احترام سے ایک محفوظ کمرے میں جگہ دیدی گئی۔ جب سارے ہندو سکھ ایک جگہ جمع ہوگئے تو ہزاروں آدمی ٹرین میں مقید نہتے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ بعض مسلمان بے بس اور بے کس ہوتے ہوئے بھی اس بے جگری سے لڑے کہ ایک ایک نے بیس بیس دشمن ڈھیر کردئے۔ بعض نے دشمن ہی سے بندوقیں چھین کر جواں مردی کے وہ جوہر دکھائے کہ یہ ہزاروں بیر سورما کئی گز پیچھے ہٹ گئے۔ مسلمان خواہ کیسے ہی بہادر تھے پھر بھی نہتّے اور دشمن کی سرزمین میں گھرے ہوئے تھے۔ اپنے گھر میں تو کتا بھی شیر ہوتا ہے۔ یہی کیفیت اس وقت مسلح دشمنوں کی تھی جو ان غریبوں سے جنگ کر رہے تھے۔ آخر مظلوم ٹرین سے نکل کر جنگلوں اور کھیتوں کی طرف بھاگے۔ چیخوں، نالوں اور فریادوں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ وحشت ناک نعرے اس پر مستزاد تھے۔ ہمیں کھڑکیوں سے سب کچھ نظر آرہا تھا۔ یہ ہولناک واردات دیکھ کر بعض شریف النفس ہندو سکھ بھی مغموم ہوگئے۔ وہ روزانہ ایسے واقعات دیکھ کر اکتا گئے تھے۔ انھیں بھی کچھ کہنے سننے کی جرأت نہیں تھی۔ مسلمانوں کی حمایت کرکے کوئی خواہ مخواہ بزدل اور غدار کیوں کہلاتا۔ جب یہ ہنگامہ ختم ہوا تو دور دور تک لاشوں کے انبار پڑے تھے۔ جا بجا خون بکھرا ہوا تھا۔ ریلوے لائن کے کنکر تک ایک ایک کرکے لہو میں اس طرح نہائے ہوئے تھے کہ ان پر سنگِ سرخ کے ٹکڑوں کا گمان ہوتا تھا۔ ان واقعات سے ہم اس قدر خوف زدہ ہوئے کہ دور دور تک اسٹیشن ہی میں چھپے رہے۔ آخر کار ایک جنگل کی راہ لی جو قریب ہی اسٹیشن سے کوئی دو میل کے فاصلے پر تھا۔ حیدر نے کہا بھی کہ اب آگے چلنا چاہیے لیکن میں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میرے جذبات اس قدر مجروح

ہو چکے ہیں کہ اب تو ایک میل بھی نہیں چل سکتا۔ میں تو یہیں جنگل میں چند روز آرام کروں گا۔ تمہیں جانا ہے تو چلے جاؤ۔ لیکن اس بے چارے نے بھی میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ اتفاق کی بات ہے کہ جنگل میں ہمیں ایک غیر آباد جھونپڑی مل گئی۔ بس اسی میں ڈیرہ ڈال دیا۔ تین دن تین رات میری کیفیت مجذوبوں کی سی رہی۔ آخر ایک دن ہوش آیا تو حیدر نے صلاح دی کہ کسی نزدیکی گاؤں سے کچھ آٹا چاول مانگ لائیں۔ بس ایسا ہی کیا گیا۔ آٹا چاول لانے کے بعد لکڑیوں کی فکر ہوئی۔ کہا چلو جنگل سے اکٹھی کر لائیں۔ اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے ایک گیلی جو پانچ فٹ لمبی ہوگی کچھ دور پڑی دکھائی دی۔ حیدر نے کہا کہ اسے بھی اُٹھا کر لے چلیں دھونی میں سلگتی رہے گی۔ میں نے قریب جا کر یونہی بے مطلب سی ٹھوکر جو ماری تو وہ الٹ کر سیدھی ہوگئی۔ دیکھا تو ایک عورت کی لاش اوندھی پڑی تھی۔ یہ اتنی سخت ہو چکی تھی اور مٹی پڑ پڑ کر حلیہ اتنا بگڑ چکا تھا کہ گیلی معلوم ہوتی تھی۔ اسے دیکھ کر بڑی عبرت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد چند قدم چل پھر کر، چھوٹی چھوٹی سوکھی لکڑیاں جمع کیں اور جھونپڑی میں لوٹ آئے۔ دو تین برتن ہمارے تھیلے میں تھے۔ حیدر نے ایک میں چاول اُبلنے کے لئے چولھے پر رکھ دیئے۔ جب آگ خوب چمک اُٹھی تو چولھے سے بدبو سی آنے لگی۔ سوچا کوئی لکڑی خون میں لتھڑی ہوئی ہوگی، جبھی بو آتی ہے۔ خیر چاول پک گئے اور ہم کھا کر سو رہے۔ دوسری صبح جب چولھا صاف کیا تو انسانی بازو اور ٹانگ کی ہڈیاں پڑی ہوئی ملیں۔ حیدر نے کہا بھئی وہ لکڑیاں نہیں تھیں کسی کے اعضا تھے جنھیں موسمی تغیر اور گرد و غبار نے لکڑیوں کا ہم شکل بنا دیا تھا۔ میں بہت پریشان ہوا اور دل میں یہ ارادہ

کر لیا کہ اب اس جنگل سے نکل جانا چاہیئے۔ اسٹیشن کے قرب وجوار میں جا کر چند تازہ لاشوں کے لباس اُتار لایا۔ ایک جوڑا اپنے لئے اور ایک حیدر کے لئے۔ یہ وہم پیدا ہو گیا تھا کہ سادھوؤں کا لباس عام لوگوں کی توجہ زیادہ کھینچتا ہے لہذا اسے ترک کر دینا چاہیئے۔ پس ایسا ہی کیا گیا۔ وہ کپڑے خون کے دھبوں سے پاک کر کے پہن لئے۔ ڈاڑھیاں تو بدستور لگی رہیں۔ البتہ لباس بدل گیا اور ڈاڑھیوں کے قائم رکھنے میں مصلحت یہ تھی کہ اگر کسی موقع پر فرار ہونے کی ضرورت پیش آئی تو اُسی وقت ڈاڑھیاں اتار پھینکنے سے صورت ایک دم بدل سکتی ہے۔ اسی مصلحت کے پیشِ نظر ہم نے یہ سائن بورڈ لٹکتا رہنے دیا۔ اب ہمارا حلیہ کچھ عجیب سا تھا۔ ہندو سمجھتے تھے کہ ہم ہندو ہیں اور مسلمان جانتا تھا کہ اسلام کے فرزند ہیں۔ اپنی جھونپڑی سے کوئی سات آٹھ میل چلے ہوں گے کہ ہمارے قدم شیرشاہ سوری کی جرنیلی سڑک نے چوم لئے۔ یہاں ایک قافلہ رکا ہوا تھا۔ اس میں کوئی پانچ ہزار خانماں برباد مسلمان تھے جن میں بوڑھوں اور بچوں کی تعداد زیادہ تھی۔ قافلے کے ساتھ کوئی دس بیس ڈوگرے تھے۔ ہم بھی آگے بڑھے اور قافلے والوں میں شریک ہو گئے۔ دل میں خدا کا شکر کیا کہ اب تو پاکستان پہنچ جائیں گے۔ کوئی چار گھنٹے ستانے کے بعد قافلہ روانہ ہوا۔ افرادِ قافلہ کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ لوگ دہلی سے آرہے ہیں۔ آخر منزل بہ منزل سفر کرتے ہوئے اس جگہ آ پہنچے جہاں سے گلاب ہمیں اُٹھا کر لایا ہے۔ یہ ایک کھلا میدان ہے۔ جونہی ہم نے دریائے ستلج کو عبور کیا اور اس میدان میں قدم رکھا ہم پر توپوں اور مشین گنوں سے ہلاکت خیز بارش ہونے لگی۔ چاروں طرف نظر دوڑانے سے معلوم ہوا کہ ہم لاکھوں دشمنوں

کے نرغے میں ہیں۔ ہر طرف موت منہ کھولے ہوئے پھر رہی تھی۔ یہاں مقابلہ کرنا یا حفاظتی تدابیر عمل میں لانا قطعی ناممکن تھا۔ میں اور حیدر پھرتی سے چند لاشوں کی اوٹ میں چھپے تو سہی لیکن سخت زخمی ہوئے۔ حیدر تو اسی وقت حواس کھو بیٹھا تھا لیکن میں نیم بیہوشی کی حالت میں کراہتا رہا۔ ہنگامہ ختم ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ چند لوگ آئے اور مجھے اُٹھا کر چل دیئے۔ اُٹھانے والے کا دھندلا سا نقشہ میرے ذہن میں اب بھی ہے اور یہ گلاب ہی کے خدوخال ہیں۔

گلاب۔ جب میں وہاں پہنچا تو میری نگاہ اچانک تم دونوں پر جا پڑی۔ میں نے دیکھا کہ تمہارا اور حیدر کا سانس جاری ہے۔ میں نے تمہیں جلدی سے اُٹھا لانا ہی مناسب سمجھا۔ اور کچھ کر گذرنا تو چھوڑو وہاں تو ہماری جان کو بھی خطرہ تھا۔ میں تو اس خیال سے گیا تھا کہ اگر پچاس سو فسادیوں کا معاملہ ہوگا تو انھیں مار مار کر بھگا دوں گا لیکن وہاں قصہ ہی کچھ اور نکلا۔

طارق۔ خدا نے اُسے بچانا تھا سو بچا لیا۔

گلاب۔ بے شک۔ ورنہ مجھے تو اس وقت گمان بھی نہیں تھا کہ جسے میں اُٹھا رہا ہوں یہ اپنا ہی عزیز ہے اور حمید کا بھائی۔ مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ موت اپنے وقت سے پہلے نہیں آسکتی بالکل درست ہے۔ جنھیں بچنا ہوتا ہے وہ میدانِ جنگ میں بھی بچ جاتے ہیں اور مرنے والے کو گھر کی چار دیواری میں بھی موت آدباتی ہے۔

طارق۔ مجاہد موت سے نہیں ڈرا کرتے، بلکہ موت تو خود اُن سے ڈر ڈر کر بھاگتی ہے۔

دوڑ کر جان بچا چھپ کے کہیں پڑ لے موت
زندگی تیرے تعاقب میں چلی آتی ہے (وکی وارثی)

خالد ۔ بھئی ہم تو خوب مزے میں ہیں ۔

لطیف ۔ وہ کیسے ؟

خالد ۔ مریں گے تو جنت الفردوس میں جائیں گے اور ہمارے دشمن جون بدل کر یہیں ٹھوکریں کھائیں گے ۔

طارق ۔ بے شک ۔

گلاب ۔ اب تو آرام سے گذرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے ۔

طارق ۔ تم آزاد خیال ہو نا بھئی، جبھی کہتے ہو ۔

سجن ۔ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست ۔

خالد ۔ لو حضور نے بھی زبان کھولی ہے ۔ غنیمت جانو ۔

لطیف ۔ غنیمت جان لو مل بیٹھنے کو
جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے

پریمو ۔ بس انھیں تو یہی سوجھتی ہے ۔ جدائی کے سوا اور کوئی لفظ ہی زبان پر نہیں

طارق ۔ بھئی خفا کیوں ہوتی ہو ۔ تم سے جدا نہیں ہونے دیں گے اسے ۔

نسیمہ ۔ جس طرح میں سایے کی طرح ان کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی ہوں تم بھی ——

طارق ۔ (بات کاٹ کر) بس بس، زیادہ بے تکلفی اچھی نہیں ہوتی ۔

گلاب ۔ لو مجھے اب جانے دو ذرا گاؤں سے ہو آؤں ۔

سجن ۔ ان مستورات کو بھی ساتھ لے جاؤ کل سے آئی ہوئی ہیں ۔ آخر ان دو لڑکیوں

کی بھی حفاظت ان کے ذمّے ہے۔ وہ اِن کے بغیر اداس ہوں گی۔

طارق۔ ارے یار ہماری سنو۔

گلاب۔ بتاؤ جناب۔

طارق۔ انھیں بھی یہیں بلالو۔ آخر یہ بھی تو ہمارا ہی گھر ہے۔ جب تک ہماری فوج سلامت ہے کسی ابلیس کو ادھر آنے کی جرأت نہیں۔

گلاب۔ تم تو رفتہ رفتہ سارا نظام ہی بدل رہے ہو۔

خالد۔ بھئی انقلاب کا زمانہ ہے۔

گلاب۔ اچھا جو یار لوگوں کی مرضی۔

اس گفتگو کے بعد گلاب چلا گیا اور ہمارے مجاہدوں کی مجلس بھی برخاست ہو گئی۔

(۴)

مثل مشہور ہے کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ بس اسی طرح پریمو کی داستانِ محبت اِدھر اُدھر غیروں کے کانوں میں پہنچنے لگی۔ کسی فلسفی کا قول ہے کہ جو بات کان میں کہی جاتی ہے، وہ دور دور سے سنی جاتی ہے۔ پریمو نے اپنی سہیلیوں سے کہا۔ انھوں نے اپنے رازداروں کو بتایا۔ ہوتے ہوتے یہ قصہ گاؤں کے بچے بچے کی زبان پر رقص کرنے لگا۔ ایک مسلمان سے ایک سکھ عورت کی محبت، اور پھر اس زمانے میں جبکہ مسلمان کو مار ڈالنا کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا۔ ایسے وقت میں ایک مسلمان سے محبت کرنا موت کو بلانا تھا۔ گاؤں کے لفنگے بدمعاش جو چودھری سردار سنگھ کی شہرت اور شرافت کے زیرِ اثر عرصہ دراز سے دبے بیٹھے تھے، سر اُٹھانے لگے۔ انھیں چودھری کو ذلیل کرنے کا بہانہ مل گیا۔ لہٰذا اس قصے کو خوب نمک مرچ لگا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ چودھری حساس تھا۔ وہ یہ بدنامی برداشت نہ کر سکا۔ خودکشی نے اس کی جان لے لی۔ باپ کی موت کے بعد گلاب نے گاؤں چھوڑ دیا اور اپنے تمام متعلقین کے ہمراہ اپنی حویلی میں چلا آیا۔ اس نے دوستوں کے مشورے سے یہ ارادہ کیا کہ رات کے پچھلے پہر تمام لشکریوں سمیت جو تین چار سو کی تعداد میں تھے، پاکستان کی طرف کوچ کر دے۔ اسے اپنے ساتھیوں پر پورا بھروسہ تھا۔ لہٰذا ضروری تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ نسیمہ نے بھی فوجی لباس پہن لیا۔ پریمو نے بھی اس کی تقلید کی۔ سعیدہ کی تو چھوڑیئے

وہ تو آنے والے واقعات کے خیال وخوف سے کانپ رہی تھی۔ یہ ڈراما کھیلنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ حویلی میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔ ہر طرف ہنگامہ سا برپا تھا۔ بندوقیں صاف کی جا رہی تھیں۔ گھوڑے تیار ہو رہے تھے۔ اس مصروفیت میں یہ لوگ کچھ ایسے منہمک ہوئے کہ مقامی حفاظتی تدابیر فراموش کر دی گئیں۔ اُدھر دشمن پورے ساز و سامان کے ساتھ اس حویلی نما چھوٹے سے قلعہ کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ میں نے کوٹھے پر سے گرد و نواح کے درخت اپنی طرف بڑھتے دیکھے ہیں۔

گلاب۔ (حیرانی سے) ارے درخت دیکھے ہیں اور ہماری طرف بڑھتے ہوئے؟

سجن۔ بھوت ہوں گے۔

طارق۔ میں اوپر جا کر دیکھتا ہوں تم بھی آؤ۔

گلاب، طارق اور سجن کوٹھے پر گئے۔ چاندنی رات تھی، بالکل صاف شفاف، کافی دور تک نگاہ جاتی تھی۔ جونہی انھوں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ گرد و نواح کی جھاڑیاں، بوٹے، درخت واقعی حویلی کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ گلاب نے گھبرا کر حکم دیا کہ ڈھول پیٹ کر لشکریوں کو خبردار کر دیا جائے۔ لیکن طارق نے منع کرتے ہوئے خاموش کارروائی کی صلاح دی۔ حویلی کے گرد کوئی سو سو گز پرے ہٹ کر مورچے بنا دئے گئے۔ بندوقوں، مشین گنوں کے پیٹ بھر دئے۔ دو مشین گنیں کوٹھے پر دیوار کے عقب میں درست کر دی گئیں جہاں سے چاروں طرف فائر کیا جا سکتا تھا۔ طارق نے حکم دیا کہ اپنی طرف سے ہرگز پہل نہ کی جائے اور کوئی مشعل۔ چراغ یا لیمپ حویلی کی چار دیواری کے باہر روشن نہ رہے اور کسی قسم کا

مذہبی یا سیاسی نعرہ بھی نہ لگایا جائے۔ انھیں اطمینان سے بڑھنے دو۔ اگر فائر بھی کریں تو بھی ہمارے بندوقچی خاموش رہیں۔ سب سے پہلا فائر موقع محل دیکھ کر میں خود کروں گا۔ اس کے بعد عام اجازت ہے۔

بھوت بڑھ رہے تھے اور خوش تھے کہ حویلی والے غفلت کی نیند سوئے ہوئے ہیں اب قیامت تک نہیں اٹھیں گے۔ ادھر طارق دیوار کی اوٹ سے ہر نقل و حرکت کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کے قریب نسیمہ اور بیوی بھی ڈٹی ہوئی تھیں اور سعیدہ بے چاری دو دوسری لڑکیوں کے ساتھ حویلی کے ایک نچلے کمرے میں چھپی بیٹھی تھی۔ اسے گزشتہ مصائب ایک ایک کر کے یاد آ رہے تھے۔ سچ ہے کہ بزدل موت سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے:۔

جو مسلمان ہیں کب جنگ سے ڈر جاتے ہیں
حفظِ ملت کے لئے جاں سے گزر جاتے ہیں

تجھ کو اک بات بتاتا ہوں سمجھ لے اے قوم
لوگ جو موت سے ڈرتے ہیں وہ مر جاتے ہیں

روکی وارثی)

درختوں اور جھاڑیوں کا ہجوم بڑھ تو رہا ہی تھا مگر اب انھوں نے چند فائر بھی کر دئے جو ہوا میں گونج کر خاموش ہو گئے۔ لیکن ادھر بدستور خاموشی طاری رہی۔ ہجوم اور آگے بڑھا، پھر ذرا اور حتیٰ کہ طارق کے اندازے کے مطابق یہ لوگ حویلی کی دیواروں سے کوئی تین سو گز کے فاصلے پر آ گئے۔ یہ دیکھتے ہی اس نے مشین گن کو گولیاں اگلنے کا حکم دیا۔ اشارہ پاتے ہی حویلی کے تمام

بندوقچی مصروفِ عمل ہو گئے۔ یہ حملہ اس قدر فوری اور متواتر تھا کہ دشمن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور وہ متعدد لاشیں چھوڑ کر اپنے پہلے مقام تک ہٹ گیا۔ اب جم کر لڑنے کی باری آئی۔ دونوں طرف سے شعلے برسنے لگے۔ بندوقیں گرجنے لگیں۔ القصہ رات اسی کشمکش میں گزر گئی۔ سورج نے طلوع ہو کر جو دیکھا تو حویلی کے چاروں طرف دشمن کے سپاہی کٹی ہوئی جھاڑیاں، پتے اور ٹہنیاں سروں پر رکھے مورچوں میں ڈٹے ہوئے تھے۔ کھیتوں میں جا بجا لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ گلاب کے بھی کچھ لشکری کام آ چکے تھے۔ صبح کے بعد شام ہوئی مگر لڑائی ختم ہوتی نظر نہ آئی۔ گلاب نے موقع کی نزاکت بھانپ کر طارق سے کہا:۔

گلاب۔ ہم چاروں طرف سے گھرے ہوئے ہیں، بھاگنے کو بھی تو راستہ نہیں۔

طارق۔ بس ڈر گئے؟

گلاب۔ ڈرا نہیں، لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ عنقریب ان کی مدد کے لئے ٹینک آپہنچیں گے جس کا جواب ہمارے پاس نہیں۔

ابھی اس نے یہ فقرہ مکمل کیا ہی تھا کہ ایک گولی نہ جانے کہاں سے آئی اور سیدھی اس کی کھوپری میں پیوست ہو گئی۔ اتنے میں دو اور فائر گونجے اور ساتھ ہی نسیمہ چلائی "وہ مارا"۔ طارق نے پلٹ کر دیکھا تو دوسرے کوٹھے پر ایک شخص تڑپ رہا تھا۔ طارق نے خود تو مورچہ چھوڑنا مناسب نہ سمجھا البتہ سجن، لطیف اور پریمو کو حقیقتِ حال دریافت کرنے کو کہا۔ ان سے پہلے نسیمہ اپنے شکار کے پاس پہنچ چکی تھی۔ اس نے بتایا کہ اسی مارِ آستین نے گلاب پر گولی چلائی تھی۔ یہ قاتل ہے، غدار ہے۔ پریمو نے اسے ہلاتے ہوئے کہا "جسونت، جسونت"۔

جسونت۔ بہن پریمو! مجھے میرے پاپ کی سزا مل گئی ہے۔ معاف کردو۔ میں دراصل جاسوس تھا۔ گلاب نے جس وقت ٹینکوں کی آمد کا ذکر چھیڑا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ کوشش کے باوجود ضبط نہ کرسکا اور گولی چلادی۔ اب میں خود بھی کوئی دم کا مہمان ہوں۔ میری ایک بات سن لو کہ وہ مغویہ لڑکیاں بھی جاسوس ہیں۔ یہ سکھ ہیں مسلمان نہیں۔ انھیں جاسوسی کے لئے چودھری سردار سنگھ کے گھر بھیجا گیا تھا اور انھیں بدبختوں نے اس غریب کو زہر دیا ہے، اُس نے خودکشی نہیں کی۔

اس کے فوراً بعد جسونت کی روح کیفر کردار کو پہنچ گئی۔ اُسے جوں کا توں چھوڑ کر یہ لوگ طارق کے پاس آئے اور تمام واقعات بیان کئے۔ اُس نے اُن دونوں لڑکیوں کے لئے موت کا حکم صادر کرکے تاکید کی کہ گلاب کے مرنے کا ذکر کسی سے نہ کیا جائے ورنہ سب کے سب لشکری ساتھ چھوڑ دیں گے اور ہمارے لئے بے شمار مشکلات پیدا ہوجائیں گی۔

سجن اور خالد نے گلاب کی لاش ایک کوٹھری میں دفن کردی اور خود اُن لڑکیوں کے کمرے میں پہنچے۔ اس وقت وہ سعیدہ کی مشکیں باندھ رہی تھیں۔ شاید فرار کا ارادہ تھا۔ خالد نے جھٹ سے دو فائر کئے اور دونوں کو موت کی نیند سلادیا۔ سعیدہ کی جان میں جان آئی۔ اس کام سے فرصت ہوئی ہی تھی کہ باہر ٹینکوں کا شور سنائی دینے لگا۔ چاروں طرف آگ برسنے لگی۔ ٹینک دائرہ تنگ کرتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔ طارق نے اعلان کردیا کہ اب لڑنا فضول ہے۔ جس سے جس طرح بن سکے اپنی جان بچائے۔ یہ سن کر پریمو نے طارق، خالد، لطیف، سجن،

سعیدہ اور نسیمہ کو ساتھ چلنے کے لئے کہا اور وہ چپ چاپ چل دیئے۔ حویلی کے اندرونی صحن میں ایک کنواں تھا۔ اس میں رسی کی سیڑھی لٹکائی گئی۔ پہلے پریمو اتری۔ اُس نے پانی کی سطح کے قریب دیوار کو ذرا دھکا دیا تو وہ کھڑکی کی طرح کھل گئی۔ سب کے سب اس راستے سے ایک تہ خانے میں گھس گئے۔ یہ جگہ کوئی دس مربع فٹ تھی جہاں تھوڑا سا سامانِ جنگ اور دس بارہ وردیاں بھی پڑی تھیں۔ پریمو نے بتایا کہ باقی ذخیرہ جس کا ذکر گلاب اکثر کیا کرتا تھا باہر حویلی ہی میں ہے اور یہ ایک بالکل خفیہ مقام ہے جس کا سجن کو بھی علم نہیں تھا۔ تہ خانے کا ایک روشندان کنویں کی طرف کھلتا تھا جس کے باہر کچھ جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں جن کی وجہ سے یہ لوگوں کی نظروں سے بچا رہتا تھا۔ خیر، ان لوگوں نے اس جائے پناہ کے لئے پریمو کو خراجِ تحسین و تشکر ادا کیا۔ باہر قیامت برپا تھی۔ توپوں ٹینکوں کا زور، فریادوں، اور نالوں کی پکار، نعروں اور جے کاروں کا طوفان، حویلی کی بعض دیواریں گرنے کی آوازیں خدا کی پناہ، اس تہ خانے میں چھپنے والوں کے بھی دل لرز رہے تھے۔ تمام رات یہ ہنگامہ رہا اور صبح ہوتے ہی خاموشی چھاگئی۔ سناٹا ہو جانے کے باوجود بھی یہ لوگ وہیں چھپے رہے حتیٰ کہ تین دن اور گذر گئے۔ بھوک کی وجہ سے دم نکلنے لگا۔ آخر طارق سے نہ رہا گیا اور اس نے اس طرح زبان کھولی۔

طارق۔ بھئی اب تو باہر کی خبر لینی چاہیئے۔ ورنہ یہی تہ خانہ ہمارا مقبرہ بن جائیگا۔

نسیمہ۔ مجھے حکم دو میں باہر جاتی ہوں۔ آخر میں بھی تو مرد ہوں۔

سجن۔ نہیں، باہر میں جاؤں گا۔ میں ہوں بھی تو سکھ، میرے بچاؤ کی بھی صورت نکل آئے گی۔

طارق ۔ یہ درست ہے۔
نسیمہ ۔ (سجن سے) آپ نجومی بھی تو ہیں۔ یہاں بیٹھے ہی بتا دیں کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔
طارق ۔ چھوڑو یہ وقت مذاق کا نہیں۔ جاؤ سجن باہر جاؤ۔

اس حکم کی تعمیل میں سجن باہر نکلا تو وہاں عجیب عالم تھا۔ حویلی کا نصف حصہ گر چکا تھا۔ گلاب کے لشکری سب مر چکے تھے۔ جا بجا لاشوں پر کتے اور گِدھ جھپٹ رہے تھے۔ چیلیں فضا میں چکّر کاٹ رہی تھیں۔ دور دور تک کوئی زندہ انسان نظر نہ آتا تھا۔ البتہ ایک بات قابلِ غور تھی کہ یہ تمام لاشیں حویلی سے سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو گز دور تھیں۔ اسے طارق کے حسنِ انتظام کا نتیجہ کہیئے یا کچھ اور معلوم ہوتا تھا کہ گلاب کے ساتھیوں نے جیتے جی دشمن کو آگے بڑھنے نہیں دیا اور نہ ہی اپنے مورچوں سے پیچھے ہٹے۔ جس وقت یہ ٹینک وغیرہ حویلی کی دیوار کے قریب آئے ہوں گے تو یہاں ایک متنفّس بھی نہیں ہو گا۔ شاید اسی وجہ سے یہ رقبہ لاشوں سے محفوظ رہا۔ سجن نے طارق کو باہر بلایا اور اس نے تسلی کر لینے کے بعد سب کو نکل آنے کی اجازت دی۔ مناسب یہی سمجھا گیا کہ اِدھر اُدھر لاشوں میں منڈلانے کی بجائے حویلی کے ان کمروں میں جو بدستور محفوظ تھے آرام کیا جائے۔ نسیمہ نے جب یہ تجویز سنی تو کہا :-

نسیمہ ۔ کیا عجیب بات ہے کہ ایک قید خانے سے نکل کر دوسرے میں گھس جائیں۔
طارق ۔ بھئی بے انصافی نہ کرو۔ آخر یہ کمرے ہیں اور وہ تہ خانہ تھا۔ حالات کے تقاضے کے مطابق ہمیں سرِ دست محتاط رہنا ضروری ہے۔ آپ لوگ تشریف رکھیں۔ میں بھوجن کا بندوبست کرتا ہوں۔ حویلی اگرچہ خوب

لٹ چکی ہے پھر بھی بعض کوٹھریاں محفوظ رہی ہیں جہاں خورونوش کا سامان کافی ہے۔

نسیمہ - اچھا جو حضور کی مرضی۔

اس مختصر سی گفتگو کے بعد یہ لوگ آرام کے لئے اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے۔

طارق نے سجن اور لطیف کی مدد سے کھانا تیار کیا جو سب نے سیر ہو کر کھایا۔ اس کے بعد سب لوگ بات چیت کرنے کی غرض سے ایک جگہ جمع ہو گئے۔ طویل مشوروں نے اونگھ کو بلا لیا اور لگے آنکھیں موندنے۔ نہ جانے کیا کچھ سوچتے ہوئے طارق نے خالد کو مخاطب کیا :-

طارق - خالد کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم مرد باہر یا کسی اور کمرے میں آرام کریں؟

خالد - اخلاقاً یہی ہمارا فرض ہے، لیکن ــــــ

لطیف - لیکن کیا؟

خالد - حالات مخدوش ہیں عورتوں کو تنہا چھوڑنا نہیں چاہئے۔

نسیمہ - آپ کو ناحق ہماری فکر ہے۔ اتنے معرکوں کے بعد بھی ہمیں بزدل سمجھتے ہیں آپ؟

سعیدہ - آج ہی جنگ ختم ہوئی ہے۔

خالد - لو اب بولو۔ تم نڈر ہو تو کیا سعیدہ بھی نڈر ہے؟

پریمو - بہن سعیدہ کے سینے میں دل نہیں۔

سعیدہ - تمہارا دل بھی تو کسی اور کے پاس ہے۔ اپنے پہلو کی خبر نہیں لیتی اور

دوسروں کا سینہ ٹٹولتی ہو۔ کیوں بھائی لطیف کیا رائے ہے آپ کی۔ آپ تو شاید میری مخالفت کریں گے۔

لطیف۔ اجی مجھے ان بحثوں سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ تم باتیں کرو۔ میں باغ میں ٹہلتا ہوں۔

سعیدہ۔ موسم سرد ہے اور حالات مخدوش؟

لطیف۔ طوفان گذر چکا ہے۔

حمیدہ (یعنی سجن)۔ نا میاں باہر نہ جاؤ۔

لطیف۔ تم بھی لگے عورتوں کی سی باتیں کرنے۔

نسیمہ۔ معاف کیجئے گا۔ آپ میری توہین کرتے ہیں۔ میں بھی تو عورت ہوں لیکن میں نہیں ڈرتی۔ آپ نے تمام عورتوں کو بزدل ظاہر کر کے مجاہدہ کی توہین کی ہے۔

لطیف۔ میں اپنی عزیز بہن سے معافی چاہتا ہوں۔

پریمو۔ واہ، اتنی جلدی ہتھیار ڈال دئے تم نے۔ جاؤ ہم تم سے نہیں بولتے۔

لطیف۔ صاف کہو کہ طبیعت بھر چکی ہے۔ فقط بہانہ تلاش کرتی ہوں۔ اچھا یونہی سہی۔ ہم بھی کسی کی پرواہ نہیں کرتے۔ باہر جاتے ہیں تنہائی میں ٹہلیں گے۔

لطیف باہر چلا گیا تو نسیمہ نے پریمو سے کہا:۔

نسیمہ۔ پریمو بہن، لطیف تم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ جاؤ منا لاؤ۔

پریمو۔ نہیں وہ مجھ سے خفا نہیں ہو سکتے۔

نسیمہ۔ بھولتی ہو۔ ان مردوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ جاؤ باہر جا کر دیکھو غفلت نہ کرو۔

سعیدہ - ہاں ہاں، ٹھیک ہے۔ بعض وقت انسان ذرا سی بات پر خفا ہو جاتا ہے۔ کیا انھوں نے کہا نہیں کہ تمہاری طبیعت بھر چکی ہے۔ بہانہ تلاش کرتی ہو۔

پرمیو - لیکن میری طبیعت کس طرح بھر گئی۔ ابھی تو خیالات کو واقعات کا لباس ہی نہیں ملا۔

نسیمہ - بے شک کھل کر بات کرو۔ مرد سو گئے ہیں۔

پرمیو - بھئی۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی ہم لوگ خیالی پلاؤ پکانے میں مصروف ہیں، عملی جامہ تو پہنایا ہی نہیں گیا۔ پھر میری طبیعت کس طرح بھر گئی۔ یہ بہتان ہے۔

نسیمہ - کیا سنا نہیں کہ پلاؤ پکانے والے کی طبیعت خوشبو ہی سے بھر جایا کرتی ہے۔

سعیدہ - اور تم بھی تو خیالی پلاؤ پکا رہی ہو۔

پرمیو اس مذاق کو نہ سمجھ سکی اور کہنے لگی:-

پرمیو - معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اب بھی میری محبت کا یقین نہیں۔

نسیمہ - جبھی تو کہتی ہوں کہ باہر جا کر شکوک رفع کر لو۔ ہماری زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ اپنے مقصد کے حصول میں جلدی کرنی چاہیئے۔ نہیں معلوم کل کیا ہو۔

پرمیو - اچھا جاتی ہوں۔

اس کے بعد پرمیو اٹھ کر باہر چلی گئی۔ وہ چاہتی بھی یہی تھی کہ کسی نہ کسی بہانے باغ میں جا کر لطیف سے باتیں کرے۔ ادھر سعیدہ اور نسیمہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھیں کہ ہم نے اسے بیوقوف بنا کر باہر بھیجا ہے۔ پرمیو نے باہر جا کر دیکھا تو لطیف کو منتظر پایا۔ اس نے شوق سے کہا:-

لطیف۔ اتنی دیر لگادی پرمی۔
پرمیو۔ آنے کے لئے کوئی بہانہ بھی ہوتا۔
لطیف۔ آؤ رات کے تاریک سینے میں آتشِ محبت سے اُجالا کریں۔ شاید منزل کی راہ مل جائے۔
پرمیو۔ محبت اندھی ہوتی ہے اس کے لئے تاریکی اور اجالا برابر ہیں۔
لطیف۔ بیابانِ عشق کی راہ بھی آسان نہیں۔
پرمیو۔ ہم اپنی صداقت کی لاٹھی سے ٹٹولتے ہوئے نکل جائیں گے۔
لطیف۔ مگر سفر کے ابتدائی مرحلے کو ہی منزل کیوں نہ بنا دیں؟
پرمیو۔ مجھے انکار نہیں مگر مزے کی نیند جبھی آسکتی ہے کہ ندی نالوں کو پھلانگتے ہوئے پُرپیچ راہوں سے گزر کر میلوں کی مسافت کے بعد منزل کا منہ دیکھیں۔
لطیف۔ یہ مہینوں کا انتظار، یہ ہولناک لڑائیاں، یہ خوفناک تصادم جو سفر کے آغاز سے لے کر اب تک ہمیں پیش آچکے ہیں ابھی کم ہیں۔ پرمی حالات اس قدر خطرناک ہیں کہ اب ہمارا پاکستان پہنچ جانا کوئی یقینی امر نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کل کوئی اور حادثہ ظاہر ہو کر ہمیں موت کی نیند سلادے۔ ایسی صورت میں ہماری نامراد روحوں کو جو پریشانی لاحق ہوگی اس کا اندازہ ناممکن ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ہم شریعت کے احکام کی تعمیل کرلیں۔
پرمیو۔ جیسے آپ کی مرضی۔
نسیمہ۔ بڑی برخوردار ہو شاباش۔ میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔
پرمیو۔ بھئی میں تم سے بہت تنگ آگئی ہوں۔ تمہیں چھپ چھپ کر باتیں سننے

کی بری عادت ہے۔

سعیدہ۔ یہ اکیلی نہیں میں بھی اس جرم کی مرتکب ہوں۔

خالد۔ اور ہم تمہارے فیصلے سے سولہ آنے متفق ہیں۔

طارق۔ زندگی کا واقعی اعتبار نہیں۔

حمید۔ نہیں معلوم کب تک اس سرزمین میں چھپ چھپ کر بسر کرنا پڑے گی۔ اس لئے تم لوگوں کا بغیر نکاح اکٹھے رہنا مناسب نہیں۔ مولوی کے فرائض میں سرانجام دوں گا اور تم ایک دوسرے کے گواہوں کا کام دینا۔ نکاح کا تحریر میں لانا شرعاً ضروری نہیں۔

لطیف۔ اچھا جناب معلوم ہوا کہ پوری ٹیم کہیں چھپ کر ہماری باتیں سن رہی تھی۔

لطیف نے یہ فقرہ مکمل کیا ہی تھا کہ درختوں میں سرسراہٹ سی ہوئی۔ طارق نے جلدی سے پستول نکالا اور اندھیرے میں داغ دیا۔ خالد، حمید اور دیگر اپنی اپنی بندوق اٹھا لائے اور مختلف مقامات پر پوزیشن لے کر بیٹھ گئے۔ سعیدہ دوڑ کر بستر میں جا چھپی۔ طارق نے ایک اور فائر کیا جس کی آواز فضا میں گونجتی ہوئی دور تک سنائی دی۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ آخر یہ سمجھا گیا کہ کوئی جانور بھاگتا ہوا جھاڑیوں میں گذرا ہے۔ اطمینان ہو جانے کے بعد سب اپنی اپنی جگہ آرام سے بیٹھ گئے۔

---

(۵)

دوسرے دن جب یہ لوگ بیدار ہوئے تو سورج کافی بلندی پر آچکا تھا۔ نماز قضا ہو چکی تھی۔ دراصل رات دیر سے سونے کا نتیجہ بھی یہی ہے۔ خیر نماز پڑھ لی گئی۔ سجن یعنی حمید نے دور سے چند گھوڑ سواروں کو اِدھر آتے ہوئے دیکھا اور حویلی والوں کو بندوقیں تیار کر کے مورچوں میں بیٹھنے کو کہا۔ لیکن لڑائی کی نوبت ہی نہ آئی۔ آنیوالے انہی کی پارٹی کے بھاگے ہوئے جوان تھے۔ سجن نے انھیں بتایا کہ گلاب اُن کے بھاگ جانے پر سخت ناراض ہے اور کسی کارِ خاص کے لئے باہر گیا ہوا ہے۔ یہ لوگ سجن کو گلاب کا رشتہ دار سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنی بزدلی پر ندامت کا اظہار کیا اور آئندہ وفادار رہنے کی قسمیں کھائیں۔ پرمیو نے انھیں بتایا کہ سچا سکھ جس کا ساتھ ایک بار دیتا ہے پھر اُسے مصیبت میں اکیلا نہیں چھوڑتا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ گلاب ضروری کام سے دہلی گیا ہوا ہے۔ چند دن میں آجائے گا" وغیرہ وغیرہ۔ یہ باتیں سن کر سب نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی بہن اور اس کے ساتھیوں کے واسطے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے۔ پرمیو نے ان سب کو بیرونی کوٹھریوں میں جگہ دے کر مختلف کاموں میں مصروف کر دیا۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ طارق اور اس کے ساتھیوں نے نکاح کی ٹھان لی تھی۔ لہٰذا اس پروگرام کو عملی جامہ پہنا دیا گیا۔ حویلی کی چار دیواری میں چپ چاپ یہ رسم ادا کر دی گئی۔ سجن اور پرمیو نے نہایت دانشمندی سے دوسرے

لوگوں کو مختلف امور میں منہمک کر دیا۔ کسی کے ذمے کھیتی باڑی کا سلسلہ تھا اور کسی کے ذمے باغ کے بیرونی حصہ کی چوکیداری۔ یہ لوگ اپنے اپنے دھندوں میں مشغول ہو کر بہت سی باتیں بھول گئے۔ طارق نسیمہ، خالد اور سعیدہ، لطیف اور پرمیو ایک دوسرے سے بلا تکلف ملنے لگے۔ شب و روز پاکستان کے خواب دیکھتے اور سیر و تفریح کے بعد سو جاتے۔ ان دنوں انھیں ایک اور الجھن درپیش تھی۔ اس روز سے جس دن رات کے وقت طارق نے کسی سرسراہٹ پر پستول سے فائر کئے تھے کچھ عجیب واقعات کا ظہور ہو رہا تھا۔ عام طور پر اشیائے خوردنی گم ہو جاتی تھیں۔ کبھی ایک برتن اپنے مقام سے سرک کر دوسری جگہ چلا جاتا۔ کبھی جھاڑیوں میں رونے کی آواز آتی۔ لیکن معاملہ سمجھ سے بالاتر تھا۔ ایک دفعہ دودھ سے لبریز گلاس طارق نے اس خیال سے رکھا کہ عشاء کی نماز کے بعد پی لوں گا اور خود نماز میں مشغول ہو گیا لیکن بعد ازاں وہ گلاس دیکھا تو قطعاً خالی تھا۔ اس نے ایک ایک سے دریافت کیا مگر سب نے قسمیں کھا کھا کر حیرت کا اظہار کیا۔ ایک بار سعیدہ منہ ہاتھ دھونے کے واسطے لوٹا بھر کر لائی اور چوکی پر رکھ کر صابون تلاش کرنے میں مصروف ہو گئی۔ چند منٹ میں لوٹا غائب تھا۔ اور کوئی دو گھنٹے کے بعد پھر اسی جگہ پڑا ملا مگر خالی تھا۔ ایک بار نسیمہ نے سوٹ کیس سے شلوار نکال کر باہر رکھی اور خود قمیص نکالنے کو جھکی تو کوئی شلوار لے گیا۔ چند جوڑے ان لوگوں نے گلاب کے آدمیوں کی وساطت سے سلوا لئے تھے اور سوٹ کیس بھی پرمیو ہی کے تھے۔ ان غریبوں کا اپنا تو کچھ تھا نہیں، یہاں جو کچھ بھی میسر تھا پرمیو ہی کی بدولت تھا۔

ایسے واقعات بہت حیران کن تھے۔ اکثر رات کے وقت جھاڑیوں میں کوئی سکتا ہوا محسوس ہوتا۔ جب کبھی سجن سے یہ بات ہوتی تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ کیوں ناحق پریشان کرتے ہو۔ کسی مقتول کی روح یہ حرکات کرتی ہے۔ جواب سن کر مرد خاموش ہو جاتے، عورتیں سہم جاتیں۔ ان بے چاریوں نے رات کے وقت باغ میں آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آسمان پر سرِ شام ہی کالی گھٹاؤں نے قبضہ جما لیا اور موسلادھار بارش ہونے لگی جس کی وجہ سے سردی بڑھ گئی۔ سب لوگ کھا پی کر بستروں میں پڑ رہے۔ اب کے یہ تمام جوڑے الگ الگ کمروں میں سویا کرتے تھے۔ بادلوں کی گرج، بارش کا شور، ہوا کی سائیں سائیں اور باغ میں سینکڑوں درختوں کے جھومنے کی آواز، دروازوں کی کھٹکھٹاہٹ دلوں میں ایک عجیب خاموشی اور قنوطیت سی پیدا کر رہے تھے۔ لوگوں نے باتیں کرنے کی بجائے چپ چاپ سو جانا زیادہ مناسب سمجھا۔ سب طرف ایک مہیب سناٹا چھا گیا۔ طارق کے کمرے میں اب بھی زندگی کے آثار پائے جاتے تھے ایک طویل سکوت کے بعد طارق نے نسیمہ سے کہا:-

طارق۔ اُٹھو نماز عشاء پڑھ لیں۔

نسیمہ۔ باجماعت ہی پڑھیں گے وضو تو کر لو۔

طارق۔ میں پانی لے آؤں، تم جانماز بچھا دو۔ اُف کس قدر سردی ہے۔

یہ کہتے ہوئے طارق نے دروازہ کھولا اور لوٹا لے کر پانی لانے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد نسیمہ کھونٹی سے جانماز اُتارنے کے لئے بڑھی تو اچانک پلنگ کے

نیچے سے کسی چیز کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اور کوئی ہوتا تو شاید ڈر کر بھاگ جاتا مگر یہ تھیں بی نسیمہ۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے پلٹ کر دیکھا اور پھر کچھ بھانپ کر دکھانے کے لئے توجہ دوسری جانب کر لی۔ کوئی آہستہ آہستہ پلنگ کے نیچے سے نکلا۔ اور لحاف اُٹھا کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا کمرے میں ہلکی سی دیے کی روشنی تھی جس میں صاف پہچاننا آسان نہ تھا۔ تیل کی کمی کی وجہ سے دیے کے اوسان بھی خطا تھے۔ نسیمہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ لپک کر طاق سے خنجر اُٹھایا اور چور پر جھپٹ پڑی۔ نتیجے کے طور پر چور نے ایک دردناک چیخ ماری اور بیہوش ہو کر گر پڑا۔ اس عرصے میں طارق اور دوسرے ساتھی بھی دروازے پر آ چکے تھے۔ چراغ روشن کئے گئے تو ایک نوجوان حسین لڑکی بے ہوش پڑی نظر آئی۔ طارق نے سجن سے کہا:۔

طارق۔ جناب یہ ہے وہ روح جو ہماری چیزیں چرایا کرتی تھی۔

سجن۔ روح نہیں، یہ تو چور ہے۔

خالد۔ دیکھو زندہ بھی ہے یا نہیں! چیخ تو بہت دردناک تھی کہ ہم سب بستروں سے نکل کر بھاگ آئے۔

سعیدہ۔ تمہیں اس کی زندگی سے کیا؟ اب تو تم شادی شدہ ہو۔

نسیمہ۔ لو، انھیں اپنی پڑی ہے۔ بہن تم میرے بھیا پر شک نہ کرو۔

اتنے میں طارق نے لڑکی کو اُٹھا کر بستر پر لٹا دیا۔

پرمیو۔ دیکھتے نہیں ہو خون سے تر بتر ہے۔ اپنا بستر خراب کرو گے کیا؟

نسیمہ۔ اِسے پسند بھی تو ہمارا ہی بستر تھا، ورنہ تمہارا لحاف چراتی۔ خدا کا شکر ہے کہ زخم خطرناک نہیں۔ پرمیو بہن تم نرس ہو۔ تیمارداری کرو۔

یہ سنتے ہی پریمو علاج میں مصروف ہوگئی۔

سعیدہ۔ (پریمو سے) بھائی لطیف کی مرہم پٹی کے دوران میں تم نے ان پر جادو کر دیا تھا۔ اب اس بیچاری پر نہ کچھ پھونک دینا۔

اتنے میں اس لڑکی نے آنکھیں کھول دیں اور اُٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

نسیمہ۔ بہن، اطمینان سے پڑی رہو۔ تم انسانوں میں ہو، حیوانوں میں نہیں۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ تم عورت ہو تو میں کبھی ہاتھ نہ اُٹھاتی۔

پریمو۔ تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی اور یہ لحاف بھی تمہیں دیدیا جائے گا۔

یہ سن کر زخمی نے خاموشانہ آنکھیں بند کرلیں اور کمرے میں خاموشی چھاگئی۔

جوں جوں دن گذرتے گئے زخمی لڑکی صحت یاب ہوتی گئی۔ پریمو نے شب و روز اسکی محنت سے اسے اچھا کر ہی لیا۔ نسیمہ، سعیدہ اور سب گھر والوں کی محبت اور ہمدردی دیکھ کر بے سہارا لڑکی گرویدہ سی ہوگئی۔ ایک دن نسیمہ نے اس سے کہا:۔

نسیمہ۔ بہن آشا اب تو تمہاری صحت بالکل ٹھیک ہوگئی ہے۔

آشا۔ آپ کی مہربانی ہے۔

نسیمہ۔ اب تم مجھ پر بھی مہربانی کرو؟

آشا۔ میں ناچیز کیا کرسکتی ہوں؟ فرماؤ۔

نسیمہ۔ میرے زخم کو بھی مرہم کی ضرورت ہے۔

آشا۔ ہیں کیا کہا، کہاں ہے زخم؟

نسیمہ۔ دل میں، ندامت کے نشتر نے میرے دل کو چھید ڈالا ہے، مجھے افسوس

ہے کہ میں نے تم پر حملہ کیا۔ اب تک مجھے اس حماقت پر دکھ ہوتا ہے۔ تم معاف کر دو تو یہ زخم مندمل ہو جائے گا۔

آشا۔ آپ مجھے شرمندہ کرتی ہیں۔

نسیمہ۔ نہیں تو، میں خود شرمسار ہوں بخش دو۔

آشا نے دیکھا کہ دو بڑے بڑے آنسو نسیمہ کی آنکھوں سے ٹپک پڑے ہیں۔ اُسے یقین ہو گیا کہ یہ جو کچھ بھی کہہ رہی ہے بناوٹ اور مبالغے سے پاک ہے۔ لہذا اُس نے دونوں بازو اس کے گلے میں ڈال دئے اور ماتھا چومتے ہوئے کہا:۔

آشا۔ بھئی ہم نے تمہیں بخش دیا۔

نسیمہ۔ (خوشی سے) شکریہ، اب ایک بات اور بتاؤ کہ تمہیں کہاں پہنچایا جائے۔ تمہارے وارث کہاں ہیں۔

آشا۔ واہ، خود تو اپنے گھر جا نہیں سکتیں اور دوسروں کو پہنچانے کا دعویٰ ہے۔

نسیمہ۔ ہمارا گھر کہیں نہیں۔ خاندان ختم ہو چکے ہیں۔ پاکستان میں رشتہ داروں کو تلاش کرنا بے کار ہے۔ ہندوستان میں جنم لیا تھا ہندوستان ہی میں مرنا چاہتے ہیں۔ تم ہندو ہو، تمہارے وارث یہاں آ چکے ہوں گے۔ کچھ اتہ پتہ بتاؤ انھیں ڈھونڈھ نکالیں۔

آشا۔ مجھے ان کے متعلق کچھ بھی علم نہیں اور جو ہو بھی تو میں تمہارا ساتھ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ خدا مجھے موت دیدے۔ تم مجھے بھی مسلمان سمجھو۔

اتنے میں سعیدہ اور پیرو بھی آ گئیں۔

نسیمہ ۔ سوچ لو۔

پرمیو ۔ کیا سوچ لے بیچاری

نسیمہ ۔ مسلمان ہونا چاہتی ہے۔

آشا ۔ مجھے اپنی زندگی کی قسم ٹھیک کہتی ہوں۔

نسیمہ ۔ عورت کو اپنی آبرو کی قسم کھانی چاہیئے۔

آشا ۔ (آہ بھر کر) وہ ہو بھی، آبرو تو پنڈی میں ــــ

نسیمہ ۔ مسلمانوں نے لوٹ لی۔

آشا ۔ ہرگز نہیں۔

پرمیو ۔ تو پھر کیا ہوا؟

آشا ۔ خود ہندو سورمیروں نے مجھے لوٹا ہے۔ اگر سننا چاہتی ہو تو میں ساری داستان بیان کیے دیتی ہوں۔

یہ فقرہ سنتے ہی سعیدہ باہر چلی گئی۔ اسے اپنی مصیبت کا وقت یاد آگیا۔ آشا نے کمرے سے نکلتی ہوئی سعیدہ پر ایک نظر ڈالی۔ پھر پرمیو اور نسیمہ کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گئی، جیسے تمام معاملہ اس کی سمجھ میں آگیا ہو۔

نسیمہ ۔ چپ کیوں ہو گئیں، سناؤ۔

آشا ۔ اچھا لو سنو۔ میں راولپنڈی کی رہنے والی ہوں۔ وہ راولپنڈی جس کی ہوا کشمیر کے پہاڑوں کو چوم کر آتی ہے جو سطح سمندر سے گیارہ بارہ ہزار فٹ اونچا ہے۔ ہمارا خاندان چڈہ برادری میں مشہور اور متمول تھا۔ میرے والد تجارت کرتے تھے۔ ایک دوکان کوہ مری میں تھی، ایک پشاور میں۔ میں

زندگی کی سترہ بہاریں دیکھ چکی ہوں۔ پچھلے ہی برس میں نے انٹرنس کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا ہے۔ ایک سال پہلے اس انقلاب کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔ اسکول کی شاندار زندگی، دولت کی فراوانی، سیر و سیاحت کا لطف دل کو تفکرات سے پاک رکھتے اور کبھی بھولے سے بھی طبیعت مکدر نہ ہوتی۔ موسم گرما اکثر کوہ مری میں گذرتا۔ میں اپنی محبوب سہیلیوں کو بھی ساتھ لے جایا کرتی تھی۔ آہ میری پیاری زہرہ اب مجھے بھول چکی ہوگی۔ مگر نہیں وہ ایک اعلیٰ ترین خاندان کی دختر ہے، اس کی رگوں میں ہلکا خون نہیں کہ مجھے بھول جائے۔ وہ مجھے تمام عمر نہیں بھلا سکتی۔ میری اور بھی ہندو مسلمان سہیلیاں تھیں لیکن زہرہ کو مجھ سے اور مجھے اس کے ساتھ عشق تھا۔

ہاں تو جس روز لاہور میں اسمبلی ہال کے باہر ماسٹر تارا سنگھ نے فساد کا نعرہ لگایا تو پنڈی میں بھی اُسی دن حالات مخدوش ہو گئے۔ لوگوں کو ایک دم سے نہ جانے کیا ہو گیا۔ گلی کوچے میں فساد کے بھوت ناچنے لگے۔ ہمارے محلے میں ہندو مسلمان دونوں آباد تھے لیکن تھے سب کے سب امن پسند۔ شہر بھر میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اُٹھی۔ بے گناہوں کا خون نالیوں میں بہنے لگا۔ بھولے بھٹکے مسافر ملک عدم کو سدھارنے لگے۔ پھر بھی ہمارے محلے میں سکون تھا۔ ایک دن چند ڈوگرے سرکاری موٹریں لے کر ہمیں بھارت پہنچانے کے لئے آئے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ اُسے میرے بزرگوں نے بلایا تھا یا از خود آئے تھے۔ مجھے اتنا علم ضرور ہے کہ محلے میں امن اور سکون ہوتے ہوئے بھی ہماری قوم کے لوگ مطمئن نہیں تھے۔ ہر وقت پاکستان چھوڑ دینے

کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ ڈوگروں کی آمد پر بہت سے خاندان بھارت روانہ ہو گئے۔ ہمیں چند یوم کے لئے رکنا پڑا اور والد اپنے کاروبار کی وجہ سے ٹھہرے رہے۔ جب دو چار ہفتے اور گذرے تو ہندوستان سے آنیوالے مسلمانوں نے اپنی دردناک داستانیں سنا کر مقامی لوگوں کو بھڑکا دیا۔ نتیجہ ہوا کہ ایک رات بارہ بجے کے قریب ہمارے محلّے پر بھی حملہ کر دیا گیا۔ ایک ہجوم گلی میں آیا۔ اس نے مکانوں کو آگ لگا دی۔ ہماری عظیم الشان بلڈنگ بھی جلنے لگی، بازاروں کی طرف گولیوں کی بوچھاڑ، کوٹھوں پر بموں کی بارش، چاروں طرف آگ کا طوفان، کچھ ایسا پریشان کن نقشہ تھا کہ گھر والوں کو نہ میری خبر تھی نہ مجھے ان کی۔ میں بار بار کھڑکی کی طرف لپکتی کہ کسی نہ کسی طرف کود جاؤں لیکن ایسی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ بازار میں لوگ قتل کئے جا رہے تھے اور ارد گرد کے مکانوں میں آگ لگی ہوئی تھی، کودتی تو کس طرف۔ عادت کے مطابق ایک بار پھر جو جھانکا تو میری نظر ایک سبز رنگ کے موٹر ٹرک پر جا پڑی۔ یہ نہایت تیزی سے کوچے میں دوڑ رہا تھا۔ اتنے میں یہ ہماری بلڈنگ کے آگے رک گیا۔ اس میں سے کوئی پندرہ بیس مسلح نوجوان نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں، پستول اور برچھے تھے۔ ان لوگوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر ہمارے مکان میں گھسنا شروع کر دیا۔ میں نے شور مچایا کہ مسلمان ہمارے مکان میں گھس آئے ہیں لیکن میری آواز کسی نے نہ سنی۔ شاید میرے ماں باپ مجھے چھوڑ کر بھاگ چکے تھے۔ مکان جل رہا تھا۔ آگ نصف عمارت کو پھونک چکی تھی۔ میں حیران تھی کہ آخر یہ لوگ اس خطرناک بلڈنگ میں داخل ہو کر جان

کیوں گنواتے ہیں۔ سوچنے کے بعد بھی یہ معمہ حل نہ ہوا۔ آخر ان لوگوں کے نعروں کی آوازیں میرے صحن میں سنائی دینے لگیں اور میں خوف سے بیہوش ہوگئی۔ جب آنکھ کھلی تو اور ہی نقشہ نظر آیا۔ نہ وہ مکان تھا نہ وہ ماحول۔ چند عورتیں میرے قریب بیٹھی تھیں۔ ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا کہ شاید سورگ میں ہوں، دنیا میں مجھے مسلمانوں نے قتل کر دیا ہوگا۔ مگر اس خیال کو فوراً ہی ایک محبت بھری شناسا آواز نے دور کر دیا۔

آواز۔ آشا بیٹی، گھبراؤ نہیں۔ تم اپنی بہن زہرہ کے مکان پر ہو۔

دیکھا تو زہرہ کی امّی مجھے تسلی دے رہی تھیں۔ اتنے میں زہرہ بھی آگئی اور مجھے ہوش میں دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ، بازو اور تمام جسم پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ مجھے کسی قسم کی ایذا نہیں پہنچی۔ زہرہ کی امّی نے مجھے دودھ پلایا اور سر پر ہاتھ پھیرا۔

زہرہ۔ خدا کا شکر ہے کہ تم بچ گئیں۔

میں۔ مگر کس طرح کچھ مجھے بھی بتاؤ۔

زہرہ۔ جب تمہارا مکان گرنے کو تھا تو بھائی جان لیگ کا ٹرک اور رضا کار لے کر جا پہنچے اور اپنی جان پر کھیل کر گھر میں گھس گئے۔ تم ایک کمرے میں بے ہوش پڑی تھیں۔ انھوں نے جلدی سے اٹھالیا اور یہاں لے آئے۔ سنا جاتا ہے کہ چند ہی منٹ کے بعد وہ عظیم الشان بلڈنگ راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ میں نے بھائی جان کو تمہارے بچا لانے کی سخت تاکید کر رکھی تھی۔

میں۔ اور میرے ماں باپ؟

زہرہ - ان کا کچھ بھی پتہ نہیں کہ کہاں گئے۔

میں یہ سن کر خاموش ہو گئی۔ زہرہ کی بدولت میری جان بچی تھی اس لئے اسکے بھائی پر والدین کے قتل کا الزام لگانا قطعاً نامناسب تھا۔ جس شخص کی شرافت نے یہ گوارا کیا ہو کہ بہن کی ہم جماعت کو اپنی جان پر بھی کھیل کر بچا لائے اس پر ظلم کا الزام لگانا سراسر ظلم ہے۔ سعید سے جس قدر ہو سکا اس نے کیا۔ مجھے زندہ و سلامت اُٹھا لایا۔ ممکن ہے کہ اس افراتفری کے عالم میں اُسے میرے ماں باپ کا خیال ہی نہ آیا ہو۔ میں نے دل کو یہ سمجھا دیا کہ وہ مر چکے ہیں۔

دو، چار، دس، پندرہ دن گذر گئے، پھر ایک مہینہ بھی لیکن میرے ماں باپ کی کوئی خبر نہ ملی۔ بھائی سعید نے لاہور تک آدمی دوڑائے، خود بھی تمام کیمپ چھان مارے لیکن بے سود۔ اب میں نے ارادہ کر لیا کہ زندگی کے باقی دن زہرہ ہی کے ساتھ بسر کر دوں گی۔ اس کے تمام گھر والوں نے مجھے تسلی دی کہ تم بالکل اطمینان سے رہو، یہ تمہارا اپنا گھر ہے، ہمارے لئے تم دوسری زہرہ ہو۔ جونہی تمہارے وارثوں کا پتہ لگے گا تمہیں اُن کے پاس بھیج دیا جائے گا، ورنہ ہم تمہاری تعلیم اور بیاہ شادی کا انتظام اُسی طور سے کریں گے جس طرح کہ ماں باپ کیا کرتے ہیں۔ سعید بھی ہر وقت میری تسلی تشفی میں مصروف رہتا۔ ایک دن میں نے اس کے ہمدردانہ الفاظ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بے سوچے سمجھے کہہ دیا کہ کاش آپ کی طرح میرا بھی بھائی ہوتا تو اس غریب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے گھور کر کہنے لگا:-

سعید۔ تو کیا میں تمہارا بھائی نہیں ہوں؟ خدا گواہ ہے کہ میں تمہیں زہرہ سے مختلف نہیں سمجھتا۔

میں۔ (شرمسار ہو کر) اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔ مجھے اطمینان ہو گیا ہے۔

اتنے میں زہرہ بھی آ گئی اور میرا فقرہ سن کر بولی۔

زہرہ۔ تو گویا پہلے اطمینان نہیں تھا۔ افسوس کی بات ہے آشا ہماری محبت کی اس طرح توہین نہ کرو۔ سعید کے لئے تم اسی طرح ہو جسطرح کہ میں ہوں۔

سعید۔ بے چاری کیا کرے آخر صنفِ نازک میں سے ہے۔ عورتیں کم عقل ہوا ہی کرتی ہیں۔

زہرہ۔ عورت نے تمہیں پال پوس کر ایک قابل نوجوان بنا دیا ہے۔

سعید۔ یہ تو خدا کی مہربانی ہے۔ اس نے مقدر میں یہی لکھا تھا۔

زہرہ۔ بے شک ہر بات خدا کی مرضی سے ہوتی ہے لیکن یہ بھی تو سوچو کہ اس نے اس کام کی تکمیل کے لئے عورت کو کیوں تجویز کیا۔

سعید۔ کس کام کی تکمیل کے لئے؟

زہرہ۔ انسان کی پرورش کے لئے۔ اگر عورت میں خوبیاں نہ ہوتیں تو یہ کام فرشتوں کو سونپ دیا جاتا۔

سعید۔ بڑی آئیں فلسفی کہیں کی۔

زہرہ۔ نہیں پھر۔

سعید۔ ہم نہیں مانتے۔

زہرہ۔ نہ سہی کون منتیں کرتا ہے۔

سعیدا ور زہرہ کی عمر میں صرف دو سال کا فرق تھا۔ اس لیے بے تکلفی سے بحث ہوا کرتی تھی۔ ایک دوسرے کو خوب چڑایا کرتے۔ آخر میں نے یہ کہہ کر کہ بھئی یہ کیا ستم ظریفی ہے میں پریشان ہوں اور تم مذاق میں پڑے ہو، اس جھگڑے کا خاتمہ کردیا۔ دوسرے دن سعید کہیں سے گیتا اٹھا لایا اور کہنے لگا:۔

سعید۔ لو بہن صبح جس وقت زہرہ قرآن پڑھا کرتی ہے، تم گیتا پڑھا کرو۔

میں۔ (حیرت سے) کیا کہا؟

سعید۔ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ تم سمجھ چکی ہو۔ اب صرف تعجب کا اظہار کرنا مقصود ہے۔ ایک مسلمان تمہیں گیتا پڑھنے کو کہہ رہا ہے۔ ہم لوگ متعصب نہیں ہیں۔ تمہارے مذہب کی کتاب بھی تو یہی ہے۔ افسوس تم لوگ اس کی تعلیم سے ناواقف ہو۔ ایک فاسق و فاجر مسلمان کو بھی قرآن کی بعض آیات یاد ہوں گی لیکن ہندو گیتا کے اشلوک بھول چکے ہیں۔ سنبھال کر رکھو۔ سویرے پڑھنا۔

مختصر یہ کہ اس خاندان کے ہر فرد نے میری دل جوئی کی۔ ہر وقت مجھے خوش رکھنے کی کوشش کی جاتی۔ زہرہ کے والد جب زنانے میں آتے تو پہلے مجھے پیار کرتے اور زہرہ یہ دیکھ کر خوش ہوتی۔

ایک دن سعید گھر میں آیا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ کمرے میں زہرہ اور میں لوڈو لئے بیٹھی تھیں۔ سعید نے آتے ہی کھیل بگاڑ دیا اور بساط الٹ دی اور مجھ سے کہا:۔

سعید۔ آپا مبارک ہو۔ تمہارے وارثوں کا پتہ مل گیا ہے۔

زہرہ ۔کیا کہا ؟

سعید ۔میں کوئی فلسفہ نہیں بگھارتا، سیدھی بات کہتا ہوں کہ ان کے وارثوں کا پتہ مل گیا ہے اور اب وہ انھیں لے جائیں گے۔

میں نے دیکھا کہ زہرہ کا رنگ متغیر ہو گیا اور اس نے خفیف سی آہ بھر کر پوچھا:۔

زہرہ ۔کیا وہ سچ مچ انھیں لے جائیں گے ؟

سعید ۔بظاہر تو یہی بات نظر آتی ہے۔

میں ۔ بھائی سعید مذاق نہ کرو۔

سعید ۔ٹھیک کہتا ہوں، کل سویرے معلوم ہو جائے گا۔سوہن ہندوستان سے تمہیں تلاش کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔میں نے اُسے سب حال سنا دیا تھا۔کل ڈوگرہ سپاہیوں کے ساتھ آئے گا اور تمہیں لے جائے گا۔

میں نے جب اس کی زبانی یہ واقعات سنے تو خاموش ہو گئی۔سوہن میرے چچا کا لڑکا ہے، نہایت بدفطرت، اوباش۔ وہ اکثر خلوتوں میں مجھے دق کیا کرتا تھا اور اس کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی کہ کسی نہ کسی طرح مجھے اپنی ہوس کا آلۂ کار بنائے۔یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہندو مذہب میں عم زاد کے ساتھ شادی تک بھی ممنوع ہے وہ میری جوانی کے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا۔میرے انکار پر وہ اکثر ایسی مثالیں پیش کیا کرتا لیکن میں ٹال دیتی۔اس کی ان حرکات کی وجہ سے میں متنفر ہو چکی تھی۔اب جو اس کی آمد کا ذکر سنا تو کچھ شک گذرا، مگر ہندوستان جانے کا خیال، ماں اور باپ سے ملاقات کی اُمید دل و دماغ پر غالب آئی۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی سوہن آگیا۔ میں دیوانہ وار اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ خاندان کی محبت نے زہرہ، سعید اور تمام مہربانوں کا خیال دل سے مٹا دیا۔ زہرہ اور اس کے بزرگ بادلِ ناخواستہ مجھے رخصت کرنے پر آمادہ ہو گئے اور میں سوہن اور اس کے فوجی دوستوں کے ساتھ موٹر میں سوار ہو گئی۔ میرے اور سوہن کے علاوہ کوئی پانچ سات ڈوگرے بھی اس گاڑی میں سوار تھے۔ دو تین کپتانوں سے سوہن کی بے تکلفی تھی اور وہ اسکول کے زمانے سے اس کے دوست تھے۔ راولپنڈی سے چل کر جب انھوں نے سیالکوٹ کا رخ کیا تو میں نے سوہن سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ سیدھے لاہور اور واہگہ کی طرف کیوں نہیں چلتے۔ اس نے جواب دیا کہ چند فوجی مصلحتوں کی وجہ سے ایسا کیا جا رہا ہے۔ تم فکر کیوں کرتی ہو، جموں سے ہوتے ہوئے بھارت کی طرف نکل جائیں گے۔ میں خاموش ہو گئی۔ آخر کار ہم لوگ جموں پہنچ گئے۔ شہر کے باہر ایک کوٹھی میں ٹھہرے۔ ہمارے ساتھ سوہن کے چار فوجی افسر بھی تھے۔ شام سے پہلے سوہن نے مجھے بتایا کہ ہمیں مہینہ بیس دن یہاں ٹھہرنا پڑے گا اس لئے پورے اطمینان کے ساتھ اپنا گھر سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرو۔ کسی قسم کا اندیشہ اپنے دل میں نہ لاؤ۔ اب تم مسلمانوں سے کوسوں دور ہو۔ میں نے غسل کیا اور اُن جوڑوں میں سے جو زہرہ نے سلوا کر مجھے دیئے تھے ایک اچھا سا سوٹ پہن کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ سورج غروب ہوا تو کمروں میں بجلیاں روشن کر دی گئیں۔ میں نے کھانا منگوایا اور کھا کر شام ہی سے لیٹ گئی۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد سوہن جھومتا ہوا میرے پاس آیا اور میرے پاؤں میں بیٹھ گیا۔ میں نے گھبرا کر اُٹھتے ہوئے کہا:۔

میں۔ تم نے پی ہوئی ہے؟

وہ۔ ہاں یہ تو میرا روز کا مشغلہ ہے، نئی بات نہیں۔ پھر فوجیوں کے ساتھ تو پینی ہی پڑتی ہے۔ یہ ساتھ والے کمرے میں کپتان جنگل اور سبھی دوست پی رہے ہیں آؤ تمہیں دکھاؤں کیا ڈر ہے۔

میں۔ کیا کہتے ہو کچھ شرم کرو سوہن!

وہ۔ نہیں وہ شرابی نہیں ہیں۔ اتنی نہیں پیتے کہ ہوش و حواس کھو دیں۔ آؤ چلو۔

میں۔ نہیں، مہربانی۔

وہ۔ اچھا نہ سہی۔ لیکن ایک بات، کہو تو عرض کروں؟

میں۔ ہاں کہو۔

جواب میں اس نے لپک کر گلے سے لگا لیا اور تین چار بوسے بھی لے لئے۔

میں۔ شرم کرو۔

وہ۔ کس بات کی؟

میں۔ تم نہیں جانتے کہ ہمارے مذہب میں ہماری شادی بھی ناممکن ہے۔ ناجائز تعلقات تو رہے ایک طرف۔

وہ۔ مذہب کی باتیں چھوڑو۔ وہ تو پرانا ہو چکا ہے۔ محبت میں جائز و ناجائز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تمہیں برسوں سے چاہتا ہوں، مجبور ہوں۔

وہ مجھ سے لپٹ گیا اور دیوانہ وار میرے کپڑے پھاڑنے لگا۔ میں چلائی تو ساتھ والے کمرے سے آواز آئی "کوئی بات نہیں، کوئی غیر تھوڑا ہی ہے تحمل سے کام لو۔"

میں نے احتجاج کیا تو سوہن نے کہا:۔

سوہن۔ ناحق بگڑتی ہو۔ آخر کونسا کل پرزہ گھس جائے گا۔ یاد رکھو اگر نہیں مانوگی تو موت کی نیند سلادوں گا۔

یہ کہتے ہوئے اس نے ریوالور میری چھاتی کے ساتھ لگا دیا۔ اس کے بعد میں بے بس تھی میرے حواس ختم ہو چکے تھے۔ رات کے پچھلے پہر جب مجھے ہوش آیا تو کپتان جگل اور لفٹنٹ کشور کھڑے نشے میں جھوم رہے تھے اور میں بالکل برہنہ تھی۔ میں شرم کے مارے سمٹ کر بیٹھ گئی تو انھوں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا:۔

وہ۔ آشا پرانے زمانے کی عورت مت بنو۔ آزاد قوموں میں یہ تو معمولی باتیں ہوا کرتی ہیں اور ملک کی سیوا کے لیئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو اس فعل میں ہم تم برابر کے شریک ہیں جس طرح ایک تاش کی بازی میں۔

میں خاموش بیٹھی رہی۔ کاش خدا مجھے خودکشی کی جرأت دیتا۔ چند منٹ کے بعد سوہن آیا اور انھیں باہر لے گیا۔

اس کے بعد مدت تک وہ مجھے جگہ جگہ لیئے پھرے اور میں مجبور و ناتوان ان کے قیدی کی حیثیت سے زندگی بسر کرتی رہی۔ سوہن کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ ماتا پتا فوت ہو چکے ہیں اور دوسرے رشتہ داروں کا بھی کچھ پتہ نہیں۔ خدا جانے وہ جھوٹ کہتا تھا یا سچ۔ ادھر اُدھر پھرتے پھراتے یہ لوگ اس لشکر میں شامل ہو گئے جس نے تمہاری حویلی پر توپوں اور ٹینکوں سے حملہ کیا تھا۔ یہ لوگ شراب پی پی کر دھت ہو رہے تھے، تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ میں بھی ساتھ تھی۔ موقع پا کر بھاگ نکلی۔ رات کی تاریکی اور گھنے درختوں نے مجھے چھپا لیا۔ میں نے تمہاری محبت، اخلاق اور

باہمی ہمدردی کو چھپ چھپ کر دیکھ لیا ہے۔ اب میں تمہیں چھوڑنا نہیں چاہتی اور نہ جیتے جی چھوڑوں گی۔"

نسیمہ ۔ انشاءاللہ ہم بھی تمام عمر تمہارا ساتھ دیں گے۔

پریمو ۔ ضرور۔

اُسی دن کوئی آدھی رات کے قریب سجن نے دور سے دو آتشیں آنکھوں کو حویلی کی طرف گھورتے دیکھا۔ اس نے خیال کیا کہ شاید دشمن کی جیپ کار ہے۔ اس کے بعد ایک اور جیپ دکھائی دی، پھر ایک اور، پھر ایک اور۔ گویا ایک زبردست لشکر اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے دوڑ کر سب کو جگایا۔ سب افراتفری کے عالم میں گھبرا کر اُٹھے اور کنوئیں میں اُتر گئے۔ جلدی میں سعیدہ بے چاری کا پاؤں جو پھسلا تو وہ دھڑ سے گری۔ خیر یہ ہوئی کہ اس کا دایاں ہاتھ رسی کی سیڑھی سے نہ چھوٹا۔ بڑی مشکل سے اس کو سنبھال کر تہ خانے میں لے جایا گیا۔ اتنے میں کوئی پندرہ بیس جیپ کاریں حویلی کی دیوار کے قریب آکر ٹھہر گئیں اور کوئی سو پچاس فوجی اسٹین گنیں لئے ہوئے اتر پڑے۔ سجن کو امید تھی کہ وہ مجھے سکھ سمجھتے ہوئے محبت سے پیش آئیں گے لیکن یہاں معاملہ ہی کچھ اور نکلا۔ ایک افسر نے آتے ہی ٹھوکر ماری اور پوچھا:۔

افسر ۔ کون ہو تم، یہاں کیا کرتے ہو؟

سجن ۔ مہاراج میں بیمار ہوں۔

افسر ۔ ابے تمہارے مہاراج کی ایسی کی تیسی۔ ہم بلوچ ہیں سنا تم نے؟

دوسرا افسر۔ ہم تمہارے مہاراج کے باپ کو بھی کچھ نہیں سمجھتے۔ اتنے مسلمان مروا کر اب بھی بیمار بنا بیٹھا ہے۔

سجن نے جب یہ سنا کہ یہ پاکستانی مجاہد ہیں تو اس نے حوصلے سے لب و لہجہ بدل کر کہا:۔

سجن۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ بلوچ ہیں۔ حضور میں بھی سکھ نہیں ہوں۔ حالات کے پیش نظر یہ بھیس اختیار کیا تھا جس کی وجہ سے بہتوں کی جان بچا چکا ہوں۔ پھر بھی خدا کا شکر ہے۔

اس کے بعد اس نے مفصل واقعات سنائے۔ افسروں نے بتایا کہ ہم برما سے آرہے ہیں۔ پاکستان جاتے ہوئے یہاں سے گذرے۔ راستے میں چند لاشیں نظر پڑیں تو خیال پیدا ہوا کہ ضرور بالضرور اس حویلی میں مظلوم مسلمان قید ہوں گے۔ انھیں بچانا چاہیئے خدا کا شکر ہے کہ ہماری محنت رائگاں نہیں گئی۔ اس کے بعد سجن نے تمام دوستوں کو تہ خانے سے بلوا لیا اور ہر ایک کا تعارف کرایا۔ فوجیوں نے ان کے اعزاز میں سلامی دی۔ اتنے میں صبح ہو گئی اور طارق نے کڑک کر اذان دی۔ بلوچ افسر کی زبان سے فوراً اقبال کا یہ مصرعہ نکلا :۔

وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دلِ کہسار

طارق کی امامت میں نماز ادا کرنے کے بعد یہ تمام قافلہ پاکستان کی جانب روانہ ہو گیا۔ گلاب کے ملازموں نے مجاہدوں کو آبدیدہ ہو کر رخصت کیا۔

---

(۶)

شیر شاہ سوری کی جرنیلی سڑک پر دورِ حاضر کے اسلامی جرنیل سفر کر رہے تھے۔ جس طرف سے گذرتے دشمنوں کی آنکھیں جھک جاتیں، لوگ دم بخود ہو جاتے اور درخت ہوائیں جھولنا بند کر دیتے۔ بلوچ نوجوان جا رہے تھے اور ان کے لبوں پر ایک مجاہدانہ نغمہ کھیل رہا تھا جس سے آنکھوں میں نُور اور دل میں سرور پیدا ہوتا تھا۔ وہ نغمہ یہ تھا۔

نغمہ

بڑھے چلو مجاہدو بڑھے چلو

خدا کی سرزمین پر یہاں وہاں اِدھر اُدھر
افق کے آس پاس تک پہنچتی ہے جہاں نظر
نہ اِس میں امتیاز ہو یہ شام ہے یہ ہے سحر
علی علی پکارتے فسادیوں کو مارتے

سنورتے اور سنوارتے

بڑھے چلو

بڑھے چلو مجاہدو بڑھے چلو

نبیؐ کے تم غلام ہو جہان کے امام ہو
خدا کی تم پہ برکتیں رسولؐ کا سلام ہو
عدو پہ اس طرح پڑو کہ زندگی حرام ہو
علی علی پکارتے فسادیوں کو مارتے
سنورتے اور سنوارتے

بڑھے چلو

یہ کوہ اور یہ بحر و بر ہر اک کا چیر دو جگر
چھپے ہوئے حریف ہیں کوئی اِدھر کوئی اُدھر
جیو خدا کے واسطے مرو خدا کے نام پر
علی علی پکارتے فسادیوں کو مارتے
سنورتے اور سنوارتے

بڑھے چلو

پٹو گے تم محال ہے　　یہ وہم ہے خیال ہے
نظر تمہاری تیغ ہے　　تمہارا عزم ڈھال ہے
تمہارے ساتھ دمبدم　　خدائے ذوالجلال ہے
علی علی پکارتے　　فسادیوں کو مارتے
سنورتے اور سنوارتے
بڑھے چلو
بڑھے چلو مجاہدو بڑھے چلو

(وَلی وارثی)

تقریباً شام کے وقت یہ لوگ پاکستان کی سرحد میں داخل ہوئے۔ بتعدد جگہ ٹھہرتے رُکتے ہوئے اپنے قومی وطن کی حدود میں پہنچے۔ سب کے سب خوشی میں دیوانے ہو رہے تھے۔ یہ فوجی بھی پہلی دفعہ یہاں آئے تھے۔ ان کے لئے بھی پاکستان کی سرزمین کو چومنے کا پہلا موقع تھا۔ سرحد میں داخل ہوتے ہی نہر کے کنارے نمازِ مغرب ادا کی گئی۔ اس کی امامت بھی

طارق ہی کے سپرد تھی۔ نماز کے بعد اس نے نہایت درد بھرے انداز میں دعا مانگی۔

"اے خدا! ہماری قوم کو کفر و الحاد کے فتنوں سے بچا۔ اے خدا! تیرے سوا ہمارا کوئی نہیں۔ اب جبکہ تو نے ہم بدکرداروں کو اپنی رحمت سے نوازا ہے اور پاکستان سی عظیم سلطنت عطا فرمائی ہے، ہمیں اس کی حفاظت کی قوت بھی مرحمت فرما، ہم سے نفاق و انتشار ے اور اتفاق و اتحاد کی دولت عطا کر۔ دیکھ کل روئے زمین پر تیرے نام لیواؤں پر ستم توڑے جا رہے ہیں، ہر طرف خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں اور تیرا دین مٹایا جا رہا ہے۔ بتا ہم کیا کریں کہاں جائیں۔ ہم تیرے سوا اور کسی کے نہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہماری دعا قبول کر۔"

سب نے کہا "آمین"۔

اتنے میں آسمان پر ایک ستارہ ٹوٹا جس سے گرد و نواح میں ایک عجیب روشنی پھیل گئی۔ ہر کوئی آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر ایک اور ستارہ ٹوٹا اور اس نے ایک آیت لکھ دی۔ لوگوں نے غور کیا تو فلک پر مرقوم تھا:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی ط

"اے ایمان والو! لکھا گیا ہے تمہارے لئے مقتولین کا انتقام لینا

آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے

عورت ۔"
